مولانا ابوالکلام آزاد

الہلال کے آئینہ میں

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد

مولانا ابوالکلام آزاد

الہلال کے آئینہ میں

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد

یکے از مطبوعات مکتبۂ دین و ادب ۱۰/۴ لاٹوش روڈ لکھنؤ

ناشر: مکتبہ دین و ادب ۔ ۱۰ لاٹوش روڈ ۔ لکھنؤ ۱

باہتمام: ساجد صدیقی • وائی آسی

مطبع: یونائیٹڈ انڈیا پریس ۔ لکھنؤ

قیمت: چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

پہلی بار: جولائی ۱۹۷۲ء

ملنے کا پتہ: مکتبہ دین و ادب ۔ ۱۰ لاٹوش روڈ ۔ لکھنؤ ۱

مصنّف ایک نظر میں

نام: ملک زادہ منظور احمد ولد ملک محمود احمد صاحب مرحوم

تعلیم: ایم۔اے (انگریزی) (تاریخ) (اردو) پی۔ ایچ۔ ڈی۔

وطن: ضلع فیض آباد

تاریخ پیدائش: ۱۷ راکتوبر ۱۹۲۹ء

مشغلہ: لیکچرر شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی۔ لکھنؤ۔

تصانیف:

اردو کا مسئلہ

کالج گرل (ناول)

شہرِ سخن

ابوالکلام آزاد فکر و فن

غبارِ خاطر کا تنقیدی مطالعہ

ترجمان القرآن کا ادبی مطالعہ

ترتیب

پیش نفظ	۷
صحافت کی مشق	۱۷
ابتدائی مشق کا جائزہ ..	۳۷
الہلال کا اجراء	۴۶
سواد و حروف	۵۳
الہلال کی ضمانت	۶۶
البلاغ	۷۱
الہلال کا ادارۂ تحریر ..	۸۰
الہلال کی دعوت ..	۹۷
مشرق وسطیٰ کے مسائل ..	۱۱۱
جدوجہد آزادی اور ہندی مسلمان	۱۱۸
الہلال کا اسلوب تحریر ..	۱۳۰
طنز و مزاح	۱۵۰

انتساب

ڈاکٹر محمود الٰہی کے نام

میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر
میرا نشیمن بھی تو شاخِ نشیمن بھی تو

(اقبال)

پیش لفظ

زیر نظر کتاب میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ابتدائی صحافتی زندگی کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہوئے ان افکار و خیالات کی نشاندہی کی گئی ہے جن کی تبلیغ مولانا نے الہلال و البلاغ کے ذریعے اپنے عنفوان شباب میں کی تھی۔ الہلال کا اجرا اُردو صحافت اور اردو دونوں کے لئے ایک چونکا دینے والا واقعہ تھا، اردو خواں پبلک نے ایسا اقبال جمیدہ ابھی تک نہ دیکھا تھا، جو اپنی زندگی کی ابتدائی منزلوں ہی میں آندھی اور طوفان بن کر لوگوں کے دل و دماغ پر چھا گیا، اس کے پیچھے مولانا کی گذشتہ صحافتی زندگی کے تجربات کے علاوہ ان کا تبحر علمی اور اسی کے ساتھ ساتھ روح عصر کی باگ پکڑ کر متعینہ منزل کی طرف اس کا رُخ پھیر دینے کا عزم بھی کام کر رہا تھا۔ ان کو اپنے مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے خود اپنا ذاتی اخبار نکالنے کا احساس تو وکیل امرتسر کی ادارت ہی کے دوران میں ہو گیا تھا، اور اس چیز کا احساس کہ "اخبار درا صل ایک زندہ ہادی ہے جو ہر قسم کی باتوں میں ہدایت کرتا ہے، بری باتوں سے متنفر دلاتا ہے اور عمدہ باتوں کی طرف مائل کرتا ہے"[1] سنہ ۱۹۰۳ء کے قبل ہی ہو چکا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں عراق، مصر اور ترکی کے سفر نے ان کو عرب اور ترکی کی قوم پرور انقلابی تحریکوں کے مطالعہ کا موقع دیا اور ان تحریکات کو آگے بڑھانے میں اخبارات نے جو رول ادا کیا تھا اس سے بھی وہ خاطر خواہ واقف ہو چکے تھے۔ ان اخبارات کے ذریعہ

---

[1] مخزن جلد ۴ نمبر ۲ مئی سنہ ۱۹۰۳ء۔ فن اخبار نویسی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے نہ صرف مذہبی طبقے میں وقت کے اہم سیاسی مسائل کا احساس اور عمل کا ذوق بیدار کیا بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں مذہب کی عزت اور محبت پیدا کردی، میرے کہنے کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ مذہبی طبقہ میں سیاسی مسائل کا احساس اور عمل کا ذوق پہلے سے موجود نہیں تھا بلکہ اس کا ماحصل صرف یہ ہے کہ علمائے حق کی وہ تحریک جو شاہ ولی اللہ سے شروع ہوئی تھی اور جس میں مذہبی فکر و عمل میں سلف کی تقلید کے ساتھ ساتھ ہر دور کے تقاضوں کے پیش نظر اجتہاد کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا، اور جس نے سید احمد بریلوی کے ہاتھوں میں سیاسی تحریک کا رنگ اختیار کیا تھا اور جس میں حاجی امداد اللہ مولانا قاسم نانوتوی اور رشید احمد گنگوہی نے مذہبی قوم پروری کا رنگ بھرا تھا اور جس کا رخ مولانا محمود الحسن نے سیکولر قوم پروری کی طرف موڑا تھا اس تحریک میں نیا رنگ وہ آہنگ مولانا نے الہلال کے ذریعہ پیدا کیا، انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کے اندر حقیقی مذہبی روح کو ابھارا، بلکہ مذہبی اور معاشرتی زندگی کی از سر نو تنظیم پر زور دیا، اور انھیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ اکثریت کا خوف دل سے نکال کر کانگریس کی قومی تحریک میں شریک ہوں، اور اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر "حکومت خود اختیاری" کے لئے جدوجہد کریں، انھوں نے دین اور سیاست کو الگ الگ خانوں میں تقسیم نہ کیا بلکہ آزادی وطن کے لئے جدوجہد کو دینی فریضہ کی حیثیت سے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا۔ اور پہاڑوں پر رعشہ پیدا کر دینے والا لب ولہجہ اختیار کر کے ان کے خوابیدہ ذہنوں کو

جھنجھوڑ کر بیدار کیا، انھوں نے یہ سبق ممکن ہے جمال الدین افغانی اور عبدہٗ سے سیکھا ہو، مگر اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ جن لوگوں کے اندر وہ اپنے نظریات کی تبلیغ و اشاعت کر رہے تھے، ان کے سامنے اُردو زبان میں اس طرح کا کوئی نمونہ پہلے سے موجود نہیں تھا، اور وہ اس عجب دار لب ولہجہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور یہ سب اس دور میں ہوا جب ہندوستان ذہنی اضطراب کے بڑے نازک دور سے گذر رہا تھا۔ اور صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے اندر سخت انتشار برپا تھا، ملوکیت کہیں دم توڑ چکی تھی اور کہیں سنبھالا لے رہی تھی، جمہوریت کی مدعی حکومتوں کے چہرے بے نقاب ہوتے جا رہے تھے اور نیاز فتحپوری کے الفاظ میں "قومی آزادی و خودداری کا احساس بڑے آزمائشی دور سے گذر رہا تھا۔ برطانوی مستعمرات کا سلطنت ختم تو نہ ہوا تھا لیکن اس کے سورج کو گہن لگنا شروع ہو گیا تھا اور وہ اپنی بقا و تحفظ کے لئے آستینیں چڑھائے ہوئے ہر انسانیت شکن اقدام پر آمادہ تھا"۔[1]

کانگریس نے ہندوستان کی آزادی کا جو بیج بویا تھا اس کو جماعتی تفریق پیدا کرکے انگریز بار آور ہونے سے روکنے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ سرسید کی تعلیمات اور علی گڑھ کی تحریک کی بنا پر مسلمانوں کی نگاہوں میں انگریزوں کا جو احترام پیدا ہو چکا تھا اس کے اثرات فضا میں ہنوز قائم تھے، اور ان کی اکثریت ملکی مسائل کو چھوڑ کر پان اسلام ازم کی تحریک میں الجھی ہوئی تھی، ترکی، بلقان اور طرابلس کے ساتھ ساتھ مذہبی لامرکزیت کا احساس انھیں اپنی جانب متوجہ کئے ہوئے تھا اور مسلمانوں

---

[1] آجکل ابوالکلام نمبر۔ صفحہ ۱۹۔

کے تمام قابلِ ذکر اخبارات شہدائے بلقان کا ماتم کر رہے تھے' زمیندار کی تمام تر توجہ ترکی پر مرکوز تھی، مسلم گزٹ انگریزوں سے ناخوش ضرور تھا مگر اس کی بھی بقول نیاز فتحپوری "نہ جارحانہ تھی نہ حریفانہ بلکہ اس کا انداز ایک ایسے دوست کا سا تھا جو روٹھتا ہے' صرف منائے جانے کی توقع پر" یہ سچ ہے کہ خود الہلال کا بڑا حصہ عثمانیت سے بھرا ہوا ہے اور ناموران غزوۂ طرابلس پر مولانا کے قلم نے بھی کافی اشک افشانی کی ہے مگر ان کے ذہن میں یہ بات شروع ہی سے صاف تھی کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے کسی بیرونی ملک افغانستان یا ترکی وغیرہ کی مدد پر بھروسہ کرنا ایک خیال خام ہے' اور قومی آزادی صرف قوم ہی کی کوشش سے مل سکتی ہے' اور اسی لئے انھوں نے الہلال کے ذریعہ یہ بھی کوشش کی کہ ملک میں اجتماعی حیثیت سے تمام فرقوں کے درمیان ایک مشترک جذبہ وطنیت پیدا کر کے مذہب وملت کے اختلافات کو کم کیا جائے تاکہ آزادی وطن کے محاذ پر سب متفق و متحد ہو جائیں انھوں نے طرابلس وبلقان کے مسائل اور ترکی کی داخلی کشاکش پر جہاں زور دار لہجے میں گفتگو کی وہیں ملک کے داخلی مسائل خصوصیت کے ساتھ مسجد کانپور کے حادثہ پر بھی اپنا سارا زور قلم صرف کر دیا' اور اس ذہنی کرب اور جسمانی مصیبت کو واضح اور روشن انداز میں قارئین کے سامنے رکھ دیا' جو ایک غلام قوم کو حاکم قوم کے ہاتھوں برداشت کرنا ہوتی ہیں' مولانا نے اس رمز کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے ذہن تک مذہب کی راہ سے زیادہ

لہ آجکل ۔ ابوالکلام نمبر ۔ صفحہ ۲۰ ۔

موثر انداز میں پہونچ سکتے ہیں، انھوں نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ مسلمانانِ عالم پر جو تنزل اور ادبار چھایا ہوا ہے اس کا سبب مذہبی بے عملی ہے اور اسی لئے انھوں نے اپنی تحریک کی بنیاد دعوت قرار دی اور قرآن مجید کے حقائق و معارف پر مقتضیات حالیہ کے مطابق درس دینا شروع کردیا۔ ۱۱ اگست کے شذرات میں الہلال نے ہماری توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ ایڈیٹوریل نوٹس کے علاوہ ایک باب جو مذاکرۂ علمیہ کا ہے" اس کے نیچے (مولانا) علمی اور مذہبی تحقیقات کے مضامین ایک خاص اصول و رنگ کے درج کرنا چاہتے ہیں، علی الخصوص ان غلط فہمیوں کی نسبت جنھوں نے برسوں سے قرآن و حدیث کے اصل حقائق و معارف پر پردے ڈال دیئے ہیں" چنانچہ انھوں نے اس بات کا بار بار اعادہ بھی کیا کہ مسلمانوں کے پولٹیکل نصب العین کو بھی قرآن کریم سے ماخوذ ہونا چاہئے اور ان کو اس راہ میں بھی از روئے مذہب قدم رکھنا چاہئے" نہ کہ بہ اتباع حریت جدیدہ یورپ و تقلید اخوان وطن" انھوں نے یہ بتلایا کہ اسلام اور قومیت ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں بلکہ مجموعی قومی مفاد کا تصور اسلامی تصورات کے عین مطابق ہے اور مذہب کا حقیقی تصور ایک سیکولر حکومت کی تشکیل کی حوصلہ اس لئے دیتا ہے کہ ایک مذہب کے ماننے والے دوسرے مذہب کے پیروؤں پر ظلم نہ کرسکیں وہ بحیثیت مسلمان کے اسلام کی آفاقی تعلیمات اور حیات آفریں دعوت کا عنصر عشیر چھوڑنے پر تیار نہ تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ہونے کے ناطے وہ ہندوستان کی ساری تہذیبی میراث کے وارث بھی رہنا چاہتے

تھے، مذہب و قومیت کا یہ متوازن امتزاج جو سیاسی حقوق طلبی میں برادرانِ وطن کے ساتھ بے خوفی، برابری اور اعتماد کا سبق دیتا ہے، مولانا نے الہلال کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر عام کیا اور ملک میں بسنے والی دیگر قوموں کے ساتھ ایک باعزت اشتراک کی دعوت دی، مولانا کے اس نقطۂ نظر میں نہ مذہبی دیوانگی تھی نہ مذہب کی آڑ، بلکہ اس کے پیچھے مذہب کی وہ حقیقی روح کارفرما تھی جو تشکیک و تذبذب اور کفر و الحاد کی وادیاں طے کرنے کے بعد انھوں نے حاصل کی تھی۔

الہلال کے بند ہو جانے کے بعد جب مولانا نے البلاغ جاری کیا یا اس کے بہت دنوں بعد دوبارہ الہلال نکالا تو اس کی منزلِ مقصود بھی نہ ہی تھی، اگر کچھ فرق تھا تو وہ محض طریقِ ابلاغ کا تھا۔ نفسیاتِ عملی کی تہذیب و تربیت کے ساتھ ساتھ اب مولانا نے نفسیاتِ ذہنی کی طرف بھی اپنا رُخ موڑ دیا تھا۔ اور حرکت و عمل جوش و ولولہ کے ساتھ فکر و بصیرت اور روحانی عزم و ثبات کی تدریس و تلقین بھی شروع کر دی تھی، خونِ منصور کی شعلہ آہنگی اب ایک بشارت روحانی اور پیامِ طاغوتیت شکن میں تبدیل ہو چکی تھی، پردۂ کتاں چاک ہو چکا تھا اور نظارۂ ماہ کے لئے لوگوں کو تیار کرنا باقی رہ گیا تھا، ابتدائی دور کے الہلال نے ملک کے سیاسی، علمی، ادبی اور دینی افکار و عقاید پر اپنے نقوش مرتب کر دئے تھے۔ اور ۱۹۱۲ء کے بعد جو اجتماعی ذہنیت ظہور پذیر ہوئی تھی ان کے اندر وہ عناصر و مبادیات کارفرما تھے جن کی تبلیغ الہلال نے کی تھی، مذہب، سیاست، ادبیات، علوم و فنون اور معلوماتِ عامہ اور اس کے دیگر ابواب پر مولانا کی انفرادیت

...اور مجتہدانہ زاویۂ نگاہ کے اثرات..............................

....

...پچھلی حرکت کے ردِ عمل کی شکل میں ظاہر ہو چکے تھے، وہ اب خصوصیت کے ساتھ مسلمانانِ ہند کی قومی و اجتماعی ذہنیت کی تشکیل اور اس کے اہم مباحث پر لکھنا چاہتے تھے، یہ سچ ہے کہ آخری دور کے الہلال نے ان تمام دعوؤں کو خاطر خواہ پورا نہ کیا، جو مولانا بار بار دہراتے رہے، اور اب اس کی ترتیب میں وہ جوش و خروش بھی باقی نہ رہ گیا تھا، جو ابتدائی دور میں پایا جاتا تھا مگر اس کے باوجود مولانا نے صحافت کے اصولوں کو جس سلیقے اور حسن کے ساتھ برتا، اور ملکی و ملی مسائل پر جس بے لاگ اور حقیقت پسندانہ انداز میں غور و فکر کی دعوت دی وہ کسی دوسرے معاصر اخبار یا رسالہ سے نہ ہو سکا، اختلافی مسائل میں حمیتِ فکر اور جرأت مندی، دینی مسائل پر معقول نقطۂ نظر اور سائنٹفک صحافت کے اصول و ضوابط کو جس انداز میں مولانا نے اپنایا، اور طباعت و ترتیب اور تصاویر کے اندراج کا جو اہتمام و التزام انھوں نے کیا وہ اردو صحافت میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، یہ اسی فعّال جریدہ کا کارنامہ تھا کہ نہ صرف اردو ادب پر بلکہ ملک کی قومی اور ملی تحریکات پر اس کی پرچھائیاں پڑیں اور اس ایک چراغ سے فکر و فن کے بہت سے نگارخانے منور ہو گئے، جماعت اسلامی کا وہ رنگ و آہنگ جو برصغیر ہند و پاک میں آج ہر شخص محسوس کر رہا ہے، مولانا کی شرمندۂ تعبیر نہ ہونے والی "حزب اللہ" کے ان بنیادی تصور و ضوابط

عکس دیکھا جا سکتا ہے جن کی تبلیغ انھوں نے اپنے اسی پرچہ کے کچھ شماروں میں کی تھی، اور صرف یہی نہیں بلکہ جس بے پناہ اخلاقی جرأت کے ساتھ کسی خوف یا مصلحت اندیشی کے بغیر الہلال نے بات کی اور بات کہنا سکھلایا اور حق دوستی اور حق پرستی کے شدید جذبہ کو قوتِ محرکہ میں تبدیل کیا وہ نہ صرف اردو ادب میں ایک روایت بن گیا ہے بلکہ اس کی مثال مولانا کے قبل کسی دوسرے ادیب کے یہاں نہیں ملتی آخر میں میں جناب ساجد صدیقی اور دو آلی آسی صاحبان کا مشکور ہوں کہ انھوں نے اس مقالے کو زیورِ طبع سے آراستہ کر کے عوام کے سامنے پیش کیا۔

ملک زادہ منظور احمد
۸۔ حسنین مارکیٹ، لکھنؤ

مولانا ابوالکلام آزاد

الہلال کے آئینہ میں

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد

(۱)

صحافت کی مشق

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز الہلال کے اجرا سے بہت قبل جب ان کی عمر محض گیارہ سال کی تھی کر دیا تھا، ۱۸۹۹ء کے اواخر سے لے کر ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء تک کا پورا وقفہ صحافتی زندگی اور ذمہ داریوں کی مشق کا زمانہ تھا، اور اس تمام مدت میں انھوں نے اپنی فکر و فن کو مختلف رسائل و اخبارات سے منسلک رہ کر مشق بہم پہونچائی تھی اور اسی ساری مشق و محنت فکر و نظر کا نتیجہ تھا کہ الہلال بہت ہی تھوڑی مدت میں دعوت دینیۂ اسلامیہ کے احیا اور درس قرآن و سنت کی تجدید کا نہ صرف ترجمان بلکہ اسی کے ساتھ ساتھ اعتصام بحبل اللہ المتین اور وحدت کلمۂ امت مرحومہ کا لسان الحال اور واعظ بھی بن گیا، مقالات علمیہ و فصول ادبیہ مضامین سیاسیہ و فنتیہ کے مستقل عنوانات کے ساتھ ساتھ اس نے مسلمانوں کو سیاسی اور غیر سیاسی معتقدات و اعمال میں اتباع شریعت کی جو تلقین کی اور آزادی و حریت کو عین

تعلیمات مذہبی بنا کر جس انداز میں پیش کیا' اور اس کی طرز انشاء و تحریر نے اُردو علم و ادب میں جو انقلاب عظیم پیدا کیا' وہ محض ایک "خوبصورت صبح" کا کارنامہ نہ تھا' بلکہ اس کے پیچھے وہ تمام اکتسابات و عوامل کار فرما تھے جو اس تمام تر مدت میں مولانا کے ذہن و دماغ پر اثر انداز ہوئے تھے انھوں نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۸۹۹ء کے آخر ہی میں کر دیا تھا' جبکہ شاعری کے شوق کی بنا پر ان کے ذہن میں ایک گلدستہ نکالنے کا خیال پیدا ہوا چنانچہ انھوں نے نیرنگ عالم کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جو صرف آٹھ مہینے تک جاری رہا اور آٹھ نمبروں کے بعد بند ہو گیا'

پہلا اخبار جسے مولانا نے ایڈٹ کیا اس کا نام المصباح تھا۔ یہ ۱۹۰۰ء کے اواخر کی بات ہے جب مولانا کی عمر صرف بارہ برس کی تھی' مولانا فرماتے ہیں کہ :

" اس زمانے میں سب سے بڑا' بلند تر مقام جو کسی انسان کے لئے ہو سکتا تھا' یہ نظر آتا تھا کہ مضامین لکھے جائیں اور وہ ہمارے نام سے شایع ہوں' اس کے بعد اس سے بلند تر مقام یہ تھا کہ کسی اخبار یا رسالے کے ایڈیٹر ہوں[۵] "

حُسنِ اتفاق سے انھیں دنوں محمد موسیٰ نامی ایک شخص نے پریس جاری کیا' جس کی آمد و رفت مولانا کے والد کے پاس ہوا کرتی تھی' وہ تجارتی اغراض

---

[۵] آزاد کی کہانی ۔ صفحہ ۲۷۵ - ۲۷۶

سے ایک اخبار نکالنا چاہتا تھا، مولانا کی ترغیب سے وہ راضی ہوگیا اور المصباح ہفتہ اخبار کی شکل میں جاری ہوا، مولانا نے اس اخبار کا نام مصر کے اخبار مصباح الشرق کے نام پر رکھا۔ یہ اخبار دراصل مولانا کی صحافتی زندگی کا آغاز تھا اس کا پہلا نمبر عیدالفطر کے موقع پر نکلا تھا، کراچی کے مشہور انگریزی اور اسلامی مہینوں کا ایک مجموعی نقشہ شائع ہوا ہے، اس کے حساب سے عیدالفطر یکم یا ۲ فروری سن ۱۹۰۱ء کو پڑتی[1] ہے۔" اور مولانا نے لیڈنگ آرٹیکل عید کے عنوان سے لکھا تھا جسے مولانا کے بیان کے مطابق کئی اُردو اخباروں مثلاً "پیسہ اخبار" نے اپنے کالموں میں نقل کیا تھا۔

اس اخبار میں ایک صفحہ علمی مضامین، ایک صفحہ تاریخ اور سوانح عمری کے لئے تھا، امام غزالی، نیوٹن اور مسئلہ کشش ثقل وغیرہ کے متعلق مضامین مولانا نے ان صفحات میں لکھے تھے، اخبار مولانا کی روایت کے مطابق تین چار مہینے چل کر بند ہوگیا۔

ایڈیٹر کی حیثیت سے "المصباح" اخبار نویسی کی جانب مولانا کا پہلا قدم تھا یہ نقش اوّل ضرور تھا، مگر اس کے صفحات کے جو ترتیب مولانا نے بیان کی ہے، وہی ترتیب تھوڑی بہت تبدیلیوں اور مزید اضافوں کے ساتھ الہلال میں بھی قائم رہی علمی مذاکرات، سوانح خضر کے سائنسی مسائل پر مضامین الہلال کے صفحات پر بکھرے نظر آتے ہیں،

---

[1] ابوسلمان ہندی، امام الہند، تعمیر افکار، صفحہ ۲۰۳ حاشیہ

المصباح کے بند ہو جانے کے بعد مولانا نے کئی مضامین لکھ کر مخزن میں بھیجے جو شیخ عبدالقادر کی ادارت میں نکل رہا تھا، یہ مضامین شایع ہوئے، مولانا کے بیان کے مطابق ایک مضمون اخبار اور اس کے فوائد پر تھا، ایک مضمون خاقانی شیروانی کے حالات پر [1] اخبار نویسی پر مولانا کا مضمون مئی ۱۹۰۲ء کے شمارے میں شائع ہوا [2]۔ اور حکیم خاقانی پر اگست ۱۹۰۱ء میں چھپا۔ اخبار پر جو مضمون مولانا [3] کا شائع ہوا تھا، شاید اس میں نو مشقی کی خامیاں زیادہ تھیں، اس کے متعلق میر غلام بھیک مرحوم نیرنگ نے غصے کا اظہار کرتے ہوئے شیخ عبدالقادر مرحوم [3] سے کہا تھا کہ مخزن نو عمر لڑکوں کی مشق مضمون نگاری کے لئے نہیں جاری کیا گیا۔

۲ر دسمبر ۱۹۳۶ء کے ایک مکتوب میں مولانا غلام رسول مہر کو لکھتے ہیں :-

"پھر اسی زمانے میں نثر کی طرف طبیعت مائل ہوئی، مخزن نیا نیا نکلا تھا اس میں چند تحریریں بھیجیں [4]"

خاقانی شیروانی پر مضمون اس ارادے کے سلسلے میں تھا جو اس وقت شعرائے ایران کے حالات میں آب حیات کی طرح ایک تذکرہ لکھنے کا ہوا تھا [5]۔ نثر کے علاوہ مولانا کی غزلیں وغیرہ بھی اس کے حصۂ نظم میں چھپتی رہتی تھیں۔

۱۹۰۱ء میں مولانا کا تعلق احسن الاخبار سے ہوگیا، جو بعد کی صحافتی زندگی

---

[1] آزاد کی کہانی، صفحہ ۲۷۶ [2] اردو ادب، آزاد نمبر۔ صفحہ ۷۹
[3] نقش آزاد، فٹ نوٹ۔ صفحہ ۱۰۸ [4] آزاد کی کہانی۔ صفحہ ۲۷۶
[5] نقش آزاد، فٹ نوٹ۔ صفحہ ۱۰۸

میں مولانا کے لئے بہت مفید ثابت ہوا، یہ اخبار مولوی احمد حسین اور عبدالغفار کے اشتراک سے نکلا تھا۔

مولوی احمد حسین مولانا محمد علی کے بعد "تحفۂ احمدیہ" کے ایڈیٹر تھے، جو کانپور سے شائع ہوتا تھا، اور جو ازالۂ حیثیت عرفی کے ایک مقدمہ کی وجہ سے بند ہوگیا تھا، اس کے بند ہونے کے بعد وہ کلکتہ آگئے تھے، اور انھوں نے مصطفائی پریس کے مالک عبدالغفار کے اشتراک سے احسن الاخبار کو جاری کیا تھا جو ہفتہ وار تھا۔

اس اخبار سے تعلق کی بنا پر مولانا کے اندر نہ صرف مضمون نویسی کی قوی تحریک پیدا ہوئی، بلکہ مبادلے کے اخبارات و رسائل دیکھنے کا اچھا موقع ملا، مولانا فرماتے ہیں، "مصر، قسطنطنیہ، طرابلس، تیونس، الجزائر اور امریکہ کے تمام عربی اخبارات و رسائل مبادلے میں آتے تھے، یہیں پر مولانا نے عربی اخبارات کا اچھی طرح مطالعہ کیا جس کی بنا پر عالم اسلامی کے مسائل سے ان کی پوری اور گہری دلچسپی ہوگئی جو بعد میں ان کے کام آئی، مولانا بیان کرتے ہیں :۔

"یہ دلچسپی اس کے بعد برابر بڑھتی گئی، اور راس کثرت کے ساتھ میں وہاں کے حالات و مباحث کا مطالعہ کرتا رہا کہ شاید ہندوستان میں کسی اور کو اتفاق ہوا ہو، اسی دفتر میں سب سے پہلے میں نے

لہ آزاد کی کہانی ۔ صفحہ ۲۰۷

مصر کے علمی رسائل میں سے الہلال اور المقتطف کو دیکھا نیز المنار مطالعے میں آیا، اس زمانے میں مرحوم عبدالرحمٰن کواکبی کی "سجل جمعیۃ ام القریٰ" المنار میں چھپ رہی تھی، اور نیز مرحوم شیخ محمد عبدہٗ کا رد فرح انطون (ایڈیٹر) الجامعہ جو بعد کو "الاسلام والنصرانیہ" کے نام سے بصورت کتاب شائع ہوا[۵۱]"

مولانا چونکہ اس وقت سرسید اسکول سے متاثر تھے، اس لئے مذہبی مباحث سے تو زیادہ دلچسپی نہ لے سکے، لیکن المنار کی عربی کتابت اور بلاغت سے بے حد متاثر ہوئے، وہ فرماتے ہیں:۔

"بلاشبہ اس بارے میں المنار کے مجھ پر حقوق ہیں[۵۲]"

احسن الاخبار سے تعلق کے دوران میں "عربی اخبارات کے مضامین خبروں وغیرہ کا انتخاب و ترجمہ، علمی و ادبی مضمون کی ہر نمبر کے لئے ترتیب، رسالوں اور کتابوں پر ریویو اور اکثر اوقات اخبار و حوادث پر بھی بحث و کتابت، یہ تمام اقسام قلم سے نکلے[۵۳]" اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ یہاں پر بھی مولانا کی آیندہ صحافتی زندگی کے لئے زمین ہموار ہوئی۔

احسن الاخبار میں مولانا نے ہر طرح کے مضامین لکھے، کچھ مضامین کی وجہ سے بحث و مباحثہ کا ہنگامہ بھی چھڑا، جس میں اشہری مرحوم اور بعض کہنہ مشق

---

[۵۱] آزاد کی کہانی۔ صفحہ ۲۷۷-۷۸ [۵۲] آزاد کی کہانی۔ صفحہ ۲۷۸

[۵۳] آزاد کی کہانی۔ صفحہ ۲۷۸

مضمون نگار حضرات نے حصہ لیا، مولانا نے متعدد مضامین شعرائے ایران کے حالات اور ان کے کلام پر ریویو کے لکھے تھے، انھیں میں خواجہ حافظ شیرازی اور عمر خیام پر ایک پورا سلسلہ شائع ہوا اور یہ بحث چھڑ گئی کہ ان شعرا کے کلام سے ان کی زندگی اور کیرکٹر پر روشنی پڑتی ہے یا نہیں؟ مولانا کا خیال تھا کہ "اس بارے میں خواہ مخواہ بہ اصرار و تاکید توجیہیں کرنا، غیر ضروری ہے[1]"۔

اس اخبار کی موت بھی ایک ہنگامہ کی بنا پر ہوئی، مولانا نے سخت اور شدید اسلوب میں ایک مضمون بدعات محرم پر "اسلام اور محرم کے عنوان سے لکھا" اور یہ ثابت کیا کہ محرم کی تمام بدعات، رومن کیتھولک عیسائیوں اور بُت پرست قوموں سے لی گئی ہیں، اور ان کے کرنے والے اپنے تئیں اسلام کی خاص روح سے بالکل تہی کر دیتے ہیں[2]"۔ مضمون کے شائع ہوتے ہی شیعوں اور ایرانیوں میں جوش مخالفت کی ایک آگ سی لگ گئی آغا سنجر بھی اس وقت کلکتہ میں موجود تھے، محرم کا زمانہ تھا، انھوں نے اس طوفان کو ہوا دی، مولانا لکھتے ہیں :-

> "محرم کے دن تھے، روزانہ مجلسیں عزا کی ہر جگہ ہوتی تھیں قدرتی اجتماع لوگوں کو میسّر تھا، بات جوش انگیز اور مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرنے والی تھی،۔۔۔ ۔۔۔ ان مواقع سے سنجر نے پورا کام لیا۔۔۔ ۔۔۔صورت یہ قرار دی گئی کہ یہ سُنّیوں کی طرف سے

---

[1] آزاد کی کہانی ۔ صفحہ ۲۸۰ [2] آزاد کی کہانی ۔ صفحہ ۲۸۷

شیعوں پر ایک مذہبی حملہ ہے[1]"

چنانچہ آگ اس زور سے بھڑکی کہ تمام شہر میں تہلکہ مچ گیا، مولانا کے قتل کے منصوبے بنے، توہین مذہب کا مقدمہ دائر کرنے کا مشورہ ہوا! خبر مولانا کے والد تک پہونچی، آخر کار ان کے اثر کی بنا پر معاملہ رفع دفع ہوا، مگر دو تین ماہ کے بعد اخبار بند ہو گیا۔ اپنی زندگی کے اس دور میں مولانا سرسید کی تحریروں سے بے حد متاثر تھے، سرسید مرحوم کی تعلیمات نے ان کو ایک نئی دنیا میں پہونچا دیا تھا، اور مولانا کی طبیعت میں ان کی عقیدت پرستش کی حد تک پہونچ گئی تھی، مولانا خود فرماتے ہیں:۔

"میں ایک بت کی طرح سرسید کی پوجا کرتا تھا، ان کی عظمت میرے دل کے ریشے ریشے میں رچ گئی تھی، ان کا وجود میرے ذہن میں فضائل انسانی کا ایک مکمل نمونہ تھا، جس کی طرف ایک شائبہ نقص بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا تھا۔[2]"

چنانچہ اس دور میں جو مضامین انھوں نے لکھے وہ موضوع کے اعتبار سے سرسید کے خیالات سے ہم آہنگ تھے۔

احسن الاخبار کے دوران اجراء ہی میں مولوی احمد حسین کو خیال پیدا ہوا کہ "تحفۂ احمدیہ" کو کلکتہ سے نکالیں، کانپور میں یہ پرچہ ایک مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا، اور زیادہ تر ردِ عیسائیت سے متعلق مضامین شائع ہوتے

---

[1] آزاد کی کہانی۔ صفحہ ۲۸۷ [2] آزاد کی کہانی۔ صفحہ ۳۰۲

تھے، مولانا کے مشورے سے انھوں نے اسے ایک عام علمی اور مذہبی رسالہ کی شکل میں کلکتہ سے نکالا، اور اس کی ترتیب و تحریر کی ذمہ داری مولانا پر ڈال دی۔

۱۹۰۲ء میں مولانا کو "خدنگ نظر" لکھنؤ کے حصۂ نثر کی ایڈیٹری دی گئی۔ گلدستہ منشی نوبت رائے نظر لکھنؤ سے نکالتے تھے، اس میں نثر کا حصہ بھی شامل کیا گیا اور اچھے اچھے صاحبِ قلم مثلاً عبدالحلیم شرر، ڈاکٹر اقبال، منشی احمد علی کاکوروی وغیرہ اس کے مضمون نگاروں میں شامل ہو گئے۔ مولانا کا ایک مضمون عکس ریز یعنی ضوء غیر مرئی کی تاریخ انکشاف اور حقیقت پر پہلے شایع ہو چکا تھا، اور اب مولانا کے مضامین ملک کے سبھی اچھے اخبارات و رسائل میں شایع ہونے لگے، ہردوئی کے "مرقع عالم" اور حیدرآباد کے کئی رسائل جن کے نام یاد نہیں، ان میں بھی کئی مضمون خواب کی حقیقت اور علمی مباحث اور مواقع پر لکھے تھے[1]۔

"احسن الاخبار" کے بند ہو جانے پر مولوی محمد یوسف جعفری کے مشورہ سے مولانا نے "لسان الصدق" کا اجرا کیا، ملیح آبادی کی روایت کے مطابق اس اخبار کے نکالنے میں جو جذبہ ہنگامی اور وقتی طور پر کارفرما تھا وہ محض یہ تھا کہ مبادا میں اخبارات حاصل کئے جائیں، طباعت کا انتظام ہادی پریس کلکتہ میں کیا گیا اور ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو اس کا پہلا شمارہ مولانا نے شایع کیا، شروع شروع میں ارادہ یہ تھا کہ یہ رسالہ مہینے میں دو مرتبہ فلس کیپ تقطیع پر ایک جزو کا نکالا جائے مگر چھ ماہ کے بعد اس کی مقبولیت دیکھ کر اس کی ضخامت میں اضافہ کر دیا گیا، اور

---

[1] عبدالرزاق ملیح آبادی، آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی۔ صفحہ ۳۰۴ - ۳۰۳

شروع کیا تھا، اور عبارت و مطالب دونوں پر چند اعتراضات کئے تھے، ایک اور ریویو، جس میں تھوڑی نکتہ چینی مذہبی عقائد کے متعلق کی گئی تھی، مولوی حبیب الرحمن شیروانی کا تھا، مولانا لکھتے ہیں :۔

"میں نے لسان الصدق میں "حیاتِ جاوید" کے ریویو کا ایک سلسلہ شروع کیا........ بعض اخبارات نے اس کی تائید کی بعض نے مخالفت، اس طرح ایک نئی بحث چھڑ گئی"[1]

شبلی سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات بمبئی میں ۱۹۰۴ء میں ہوئی جب وہ عالم اسلام کی نامکمل سیاحت کے بعد بغداد میں بیمار پڑنے کی وجہ سے واپس لوٹ آئے، مولانا شبلی آزاد اور مولانا آزاد کو ہندوستان چھوڑ کر ولایت جانے پر الوداع کہنے آئے تھے، موضوع گفتگو امام رازی کی "محصل الافکار" تھی اور علامہ کو اس کے انطباع کی خبر نہ تھی، مولانا کی گفتگو سے وہ بے حد متاثر ہوئے، مولانا فرماتے ہیں کہ جب دوسرے دن انھیں مطبوعہ نسخہ بھی دے دیا تو میری نسبت انھیں بہت اچھا خیال پیدا ہوا"[2]

اس ملاقات سے تقریباً پانچ سال قبل مولانا اور ان کے درمیان خط و کتابت جاری تھی، جب شبلی نے الندوہ جاری کیا تو مولانا کے علمی شوق کو دیکھ کر ان سے اصرار کیا کہ وہ الندوہ سے اپنے کو متعلق کر لیں، حیدر آباد کی ملازمت سے جب مولانا شبلی نے استعفادے دیا تو انھوں نے مولانا کو لکھا کہ وہ لکھنؤ آکر قیام کریں۔ انھیں

---

[1] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ۔ صفحہ ۳۰۷

[2] آزاد کی کہانی ۔ صفحہ ۲۲۸

دنوں لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ہونے والا تھا، چنانچہ مولانا لکھنؤ پہونچے، مگر شبلی اپنی اہلیہ کی علالت کی خبر سن کر اعظم گڈھ جا چکے تھے، مولانا نے اعظم گڑھ میں ان سے ملاقات کی، اور انھیں کے ساتھ لکھنؤ واپس آئے، شبلی نے انھیں الندوۃ کا ایڈیٹر بنا دیا، مولانا لکھتے ہیں، ایک دو نمبر ایسے بھی نکلے کہ تمام تر مجھی کو بھرنا پڑا۔[۵۱] مولانا کا قیام تقریباً سات آٹھ ماہ لکھنؤ میں رہا، پھر وہ بمبئی چلے گئے،

الندوہ کی ادارت اور علامہ شبلی سے تعلقات کی بنا پر مولانا کو یہ موقع ملا کہ وہ تحریر و تصنیف کی ابتدائی منزلیں ایک کامل الفن استاد کی نگرانی میں طے کر لیں، شیخ اکرام لکھتے ہیں :۔

"وہ مضامین جنھوں نے مولانا ابوالکلام کو ادبی حیثیت سے نہیں بلکہ علمی اور مذہبی حیثیت سے پہلے پہل ملک کے سامنے پیش کیا، وہ الندوہ ہی میں شایع ہوئے تھے۔"[۵۲]

الندوہ میں مولانا کا موضوع تحریر "فرید وجدی مصری" کی کتاب "المراۃ المسلمہ" بھی تھی، جسے مولانا نے اردو میں اپنا لیا تھا، اس کتاب میں طبی شرعی اور ہر قسم کے دلائل سے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ عورت مرد کے برابر نہیں ہے، اور علمی، تاریخی، اجتماعی، تمرانی اور فلسفیانہ نقطۂ نظر سے یہ دکھایا گیا تھا کہ بے پردگی عورتوں کے طبعی فرائض کے خلاف اور فطرت کے مخالف ہے، یہ مضامین کتابی صورت میں روزبازار پریس امرتسر سے وکیل میں بزیں شایع

---

۵۱ آزاد کی کہانی ۔ صفحہ ۳۱۵ ۵۲ حشبنی نامہ ۔ صفحہ ۱۲۱

ہو چکے ہیں، کتاب کی شان نزول مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:۔
" مصر کی تعلیم یافتہ سوسائٹی کے ایک ذی اثر ممبر مسٹر قاسم امین بک ہیں جو کسی زمانہ میں پردہ کے بڑے مؤید تھے، اور یورپ کی موجودہ آزادی کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، فرنچ میں ایک رسالہ بھی پردۂ اسلامی کی تائید پر لکھا تھا..... لیکن پچھلے دنوں یکایک ان کی رائے میں انقلاب ہوا اور یورپ کی آزادی کی جگہ پر پردہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے چونکہ گذشتہ غلطی کا کفارہ ضروری تھا اس لئے پردہ کی مخالفت اور آزادیٔ نسواں کی ضرورت پر یکے بعد دیگرے دو رسالے لکھ کر شائع کئے، جن میں سے پہلے رسالے کا نام تحریر المرآۃ اور دوسرے کا نام المراۃ الجدید ہے..... قاسم امین بک کی تردید میں....... پانچ رسالے علی الترتیب لکھے گئے، جن میں....... ایک رسالہ المراۃ المسلمہ بھی ہے، جو مصر کے مشہور مصنف فریدی وجدی کی تصنیف ہے اس رسالے کے ذریعہ ہم اردو خواں پبلک کو اس قابل قدر مباحث سے واقف کرنا چاہتے ہیں جس سے ایک طرف تو آزادیٔ نسواں کے مسئلہ پر مفید روشنی پڑے گی اور دوسری طرف اس امر کا بھی اندازہ ہو جائیگا کہ مصر کا نیا علمی مذاق ہندوستان کے موجودہ مذاق سے کس درجہ مختلف ہے[1]"

---

[1] دیباچہ المراۃ المسلمہ۔ صفحہ ۲

اس کتاب میں فرید وجدی نے عورت اور اس کے قدرتی فرائض اس کی جسمانی صلاحیت، عملی دنیا میں اس کا مردوں سے اشتراک، پردہ اور اس کے متعلقہ مسائل پر بحث کی ہے، اور آخری فصل میں یہ دکھلایا ہے کہ مسلمان عورتوں کی تعلیم کا احسن طریقہ کیا ہے۔

مولانا کی نگاہِ انتخاب ترجمہ کے لئے اس کتاب پر کیوں پڑی، اس کا جواب مولانا سے سُنیئے :۔

"ہندوستان میں تقریباً بیس برس سے اس مسئلہ پر خامہ فرسائی ہو رہی ہے ...... جن لوگوں نے پردہ کی تائید میں رسالے لکھے ہیں ان میں بڑی جماعت قدیم تعلیم یافتہ لوگوں کی ہے، چونکہ ان لوگوں کی نظروں سے یورپ کا حال پوشیدہ ہے، اس لئے جو کچھ لکھتے ہیں مذہب کے بل پر لکھتے ہیں اور مذہب ہی ایک ایسی چیز ہے جس کا جادو نئے گروہ پر کارگر نہیں ہو سکتا، فرید وجدی چونکہ یورپ کی متعدد زبانوں سے واقفیت رکھتا ہے، ...... اس لئے جو کچھ لکھتا ہے یورپ کے اقوال و حالات کو پیشِ نظر رکھ کے لکھا ہے، اس بناء پر ظاہر ہے کہ المراۃ المسلمہ جس قدر نئے گروہ پر اثر ڈال سکتی ہے ہمارے یہاں کی مذہبی تحریروں سے اس قدر توقع نہیں ہو سکتی[1]"

فرید وجدی کے اس ترجمہ کے علاوہ جس کی تین قسطیں نومبر ۱۹۰۵ء دسمبر ۱۹۰۵ء

---

[1] دیباچہ المراۃ المسلمہ ۔ صفحہ ۳

اور فروری ۱۹۰۶ء کے شماروں میں شایع ہوئیں، مولانا کا مضمون "مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ بھی اکتوبر ۱۹۰۵ء کے ندوہ میں شایع ہوا، اور ایک دوسرا مضمون "القضا فی الاسلام" فروری ۱۹۰۶ء کے شمارے میں نکلا، اس دوران میں علمی خبروں کا کالم بھی دسمبر ۱۹۰۵ء، جنوری ۱۹۰۶ء، مارچ ۱۹۰۶ء کے شماروں میں مولانا نے مرتب کیے اور فروری ۱۹۰۶ء کا تو مکمل شمارہ، اور تمام مضامین مولانا کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ مارچ ۱۹۰۶ء کے ندوہ میں مولانا نے " یورپ میں گونگوں کی تعلیم" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے، جس میں گونگوں کے لئے یورپ میں تعلیمی انتظامات، اس کی ابتدا اور تاریخ، طریقۂ تعلیم اور حروف تہجی کے علاوہ ضمنی طور پر مسلمانوں کے دور میں اندھوں کی علم دوستی اور دلچسپی کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے،

۲۱ ، ۲۲ ، اور ۲۳ ، اپریل ۱۹۰۵ء کو ہونے والے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں شرکت کے لیے جب مولانا آزاد وہاں پہونچے تو جن لوگوں سے خاص طور پر ملاقاتیں رہیں ان میں شیخ غلام محمد مالک وکیل بھی تھے، مولانا لکھتے ہیں :-

"وہ اس کے بعد برابر خواہش مند رہتے تھے کہ میں وکیل میں مضامین لکھا کروں، چنانچہ گاہ گاہ مضامین بھیجتا رہتا تھا[1]"

اسی دوران میں حامد علی صدیقی جو اس وقت وکیل کے ایڈیٹر تھے، اپنی اصلی ملازمت پر واپس چلے گئے۔ چنانچہ شیخ غلام محمد نے مولانا کو خط لکھا کہ آکر تمام تر آزادی کے ساتھ

---

[1] آزاد کی کہانی ۔ صفحہ ۳۱۵

اخبار کا کام اپنے ذمے لیں، وہ اس بات پر بھی بہت زور دے رہے تھے کہ قومی خدمت اور قوم کو تعلیم دینے کا جو ذریعہ ہو سکتا ہے، وہ سب سے بہتر اخبار ہی ہے[۴]"
مولانا اس وقت الندوہ سے متعلق تھے،

۱۹۰۶ء میں جب مولانا دوبارہ انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں شرکت کے لئے لاہور گئے تو امرتسر جا کر انھوں نے عارضی طور پر اخبار کی ترتیب شروع کر دی، چونکہ وکیل کا حلقۂ اثر کافی وسیع تھا، اور مولانا اخبار سے بہتر اپنے خیالات کی اشاعت کا اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں سمجھتے تھے، اس لئے چند ہفتوں کے بعد انھوں نے اس کی ایڈیٹری کی پوری ذمہ داری قبول کر لی، مولانا فرماتے ہیں :-

"وکیل اس وقت تمام اُردو اخبارات میں سب سے زیادہ متین و سنجیدہ اور قومی معاملے میں صاحبِ رائے و نظر اخبار تسلیم کیا جاتا تھا، اور متعدد معاملات میں اس نے اپنا وقیع درجہ بھی نمایاں کر دیا تھا، مثلاً علی گڑھ کالج کے معاملات....... ٹرکی اور مصر کے معاملات سے بھی عام دلچسپی اُسی نے پیدا کرائی، اور اس بارے میں ہمیشہ آزادانہ رائیں اس کے صفحات پر نکلیں، حجاز ریلوے کے لئے چندہ کی فراہمی میں بھی اس نے بہت حصہ لیا، ایسا سمجھا جاتا تھا کہ ہندوستان میں ٹرکی کے مسائل پر آزادانہ لکھنے والا صرف یہی اخبار ہے[۵]"

تقریباً یہی موضوعات تھے جو دیگر موضوعات کے ساتھ بعد میں الہلال کے صفحات

---

[۴] آزاد کی کہانی - صفحہ ۳۱۶ [۵] آزاد کی کہانی - صفحہ ۳۱۷

میں مذکور ہوئے اور دیگر صحافتی مشق کے علاوہ یہاں کی مشق الہلال کو معیاری رسالہ بنانے میں مددگار ثابت ہوئی، اپنے بیان کے مطابق مولانا نے دو کالم کے بجائے چار کالم ایڈیٹوریل کر دیا، اور مراسلات و اقتباسات کے کالم کو بھی گزشتہ معیار سے زیادہ بلند کر دیا گیا، علمی اور تاریخی مقالات بھی ایڈیٹوریل صفحات کے علاوہ اکثر درج کیے جاتے تھے، (یہ سلسلہ الہلال میں بھی شروع کیا گیا، جس کی تفصیل مناسب موقع پر دی جائے گی)

کچھ دنوں کے بعد کثرتِ کار کی بنا پر مولانا کی صحت خراب ہو گئی۔ لیکن اسی دوران میں ان کے بھائی ابو نصر آہ کا انتقال ہو گیا اور والد کے اصرار پر مولانا کو کلکتہ لوٹنا پڑا، مولانا کے دوران قیام میں "وکیل کی اشاعت بہت بڑھ گئی، یعنی پہلے سے ڈیوڑھی ہو گئی، اور لوگوں نے اس کے مباحث اور اور علمی ادبی رنگ کی ترقی محسوس کی"[1]

۱۹۰۷ء کے اواخر میں مولانا غلام محمد کے اصرار پر دوبارہ امرتسر گئے، اس مرتبہ انھوں نے اخبار کو دو روزہ کے بجائے سہ روزہ بنا دیا، اس عرصے میں مولانا کے افکار و خیالات میں انقلابی تبدیلیاں ہو چکی تھیں، خصوصاً ہندستان کی سیاسی صورتِ حال نے انھیں کافی متاثر کیا تھا۔ شیخ غلام محمد، مولانا کے سیاسی نظریات سے متفق نہ ہو سکے، چنانچہ جولائی ۱۹۰۸ء میں مولانا نے وکیل سے قطع تعلق کر لیا۔

---

[1] آزاد کی کہانی۔ صفحہ ۳۱۸

وکیل کی ادارت اور امرتسر میں شیخ غلام محمد کے اس مولانا کے قیام نے، ان کی صحافتی زندگی پر کچھ مستقل اثرات چھوڑے جو بعد میں الہلال اور البلاغ کے صفحات میں نمایاں ہوئے، یہیں پر مولانا کا یہ عقیدہ راسخ ہوگیا، کہ قومی خدمت کے لئے اخبار اور پریس سے زیادہ مناسب حربہ کوئی دوسرا نہیں ہے، شیخ غلام محمد سے سیاسی اختلاف نے انھیں یہ بھی سبق دیا کہ "جو مقاصد اب پیش نظر ہیں، وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک ایک طاقتور اور وسیع اہتمام وانتظام کے ساتھ اپنا ذاتی اخبار نہ نکالا جائے، اور ذاتی پریس نہ ہو۔[1]" اور مولانا کا یہی احساس بالآخر الہلال کے اجرا کا سبب بن گیا، علی گڑھ کے معاملات، ترکی اور مصر کے مسائل پر آزادانہ رائیں، کسی مقصد کے لئے چندہ کی فراہمی، مراسلات واقتباسات، علمی وتاریخی مقالات اور دیگر عنوانات جو بعد میں الہلال کی زینت بنے، سب کی آخری مشق کا موقع مولانا کو وکیل کی ادارت کے دوران میں ملا۔

اپنے بھائی ابو نصر آہ کے انتقال کی خبر سُن کر جب مولانا امرتسر سے کلکتہ آئے تو ۸ دسمبر ۱۹۰۸ء کو انھوں نے خواجہ حسن نظامی کو ایک خط میں لکھا:۔

> "وسط جنوری میں ایک مستقل اخبار میری ایڈیٹری میں کلکتہ سے نکلے گا 'دارالسلطنت' میری دلی خواہش ہے کہ اس کے پہلے نمبر میں تمہارا ایک دلآویز مضمون ہو، خدا نہ کرے تمہاری علالت امید بر آئی

---

[1] آزاد کی کہانی ۔ صفحہ ۳۱۸

میں جاری ہوئے[1]"

چنانچہ یہ اخبار شائع ہوا، مولوی عبداللطیف تاجر چرم کے والد مولوی عبدالباری، پہلے کلکتہ سے دارالسلطنت نکالتے تھے، یہ اُردو کے قدیم ترین اخبارات میں تھا، اس کا پہلا نام "اُردو گائڈ" تھا، مولوی عبداللطیف نے اب اس کو دوبارہ نکالنا چاہا، چونکہ اس وقت تقسیم بنگال کا مسئلہ سرگرمی کے ساتھ جاری تھا، اس لئے نواب سلیم اللہ نے بھی خواہش ظاہر کی کہ ایک اخبار نکلنا چاہئے، چنانچہ یہ ہفتہ وار اخبار جاری کیا گیا، اور مولانا آزاد اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، چھپائی اور کتابت کا انتظام اچھا کیا گیا تھا، کچھ دنوں تک مولانا نے اس کو جاری رکھا مگر چونکہ مولوی عبداللطیف" اخبار کی پالیسی اور وقت کے مسائل کی نسبت دخل دینے لگے" اس لئے مولانا نے علیحدگی اختیار کرلی اور پھر اخبار بھی بند ہوگیا۔

مگر اب وقت آچکا تھا جب مولانا صحافت کے میدان میں پختہ مشق و پختہ کار ہوچکے تھے، وکیل امرتسر کی ادارت ہی کے دوران میں ان پر یہ واضح ہوچکا تھا کہ خیالات کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اپنے ذاتی اخبار کا ہونا نہایت ضروری امر ہے، طالبانِ حق و ہدایت، متلاشیانِ علم و حکمت خواستگارانِ ادب و انشا، تشنگانِ معارف اللہ و علوم نبویہ کو یہ پیغام مولانا دینا چاہتے تھے، اس کے لئے یہ ضرورت تھی کہ بڑے پیمانہ پر کسی اخبار یا رسالے کا اجرا کیا

---

[1] نقش آزاد۔ صفحہ ۳۴۸

جاتا، چنانچہ ان صحافتی مشقوں کو پس منظر بنا کر مولانا نے الہلال کا اجرا کیا۔

(۲)

ابتدائی مشق کا جائزہ مولانا نے الہلال کے اجرا کے پہلے جو مضامین و رسائل لکھے ان کی فہرست اور ان کے عنوانات بذاتِ خود ان رجحانات کی نشاندہی کرتے ہیں، جو اس دور میں ان کے ذہن کے اندر کارفرما تھے "تعصب کی مضرتیں" "عوائد و رسوم" "نور اللمعہ فی فضائل الجمعۃ" "خصائص محمدیہ" "منہاج العابدین" "ترجمہ نفحات الانس" "تذکرہ آب حیات کا فارسی ترجمہ" "فارسی لغت" "ہیئت جدیدہ کا ترجمہ" "مفتون صغیر و کبیر کا ترجمہ" "ندوہ سے متعلق مضامین" "ہنافتہ الفلاسفۃ کا ترجمہ" "العلوم الجدیدیت والاسلام" "المعتزلہ" "حقیقت معجزات" "حیات سرمد" اور اسی طرح کے دیگر مضامین و تراجم کا شمار دراصل ایک مشق کی حیثیت رکھتا ہے، ان میں سے بیشتر نامکمل چھوڑ دیئے گئے، کچھ شائع ہوئے اور کچھ کی طرف سے خود مولانا کی طبیعت اُچاٹ ہوگئی، اخبارات میں جو مضامین شائع ہوئے، ان میں "حمید" "اخبار نویسی" "خاقانی شیروانی" "حافظ" اور "خیام" پر مضامین، "خواب کی حقیقت" "المراۃ المسلمہ کا ترجمہ" "مسلمانوں کا ذخیرہ" "علوم اور یورپ" "القضا فی الاسلام" "یورپ میں گونگوں کی تعلیم" البتہ مولانا کی وسیع معلومات، قوت آخذہ اور ایک شاندار مستقبل کی غمازی کرتے تھے، ذیل میں مولانا کی ابتدائی تحریروں سے کچھ اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں:۔

(۱) علمی حیثیت سے دیکھو تو بڑے بڑے مصنف، اعلیٰ درجہ کے واعظ، خاندان میں موجود ہوں، دولت کے لحاظ سے دیکھو تو تمام موجودہ دولت مندوں میں ان کے ڈنکے بجتے ہوں، پھر یکایک اس خاندان کا ایسا دورِ تنزل میں آپڑنا جس سے اس کی تمام ترقیات پر پانی پھر جائے یعنی سرے سے بیڑا ہی ڈوب جائے، کوئی نام لیوا نظر نہ آئے، کوئی جاں نثار ہی نہ کرے، خود حاکم وقت بخت برگشتہ کی طرح پھر جائے، خود اپنے پرائے ہو جائیں، دم کے دم میں کارخانہ ہی پلٹ جائے اور ایک آنکھ بند کرنے والا جب ایک پل کے بعد آنکھ کھولے تو اُسے بجائے ایک خوبصورت محل کے ایک وحشت ناک لق ودق چٹیل میدان نظر آئے، نہ اس کے سر بہ فلک محلوں کا کچھ نشان معلوم ہو، اور نہ اس صادق پوری دیواروں کی کچھ یادگار باقی ہو، بس ایک انقلابی صورت دیکھنے والے کو حیرتی اور مبہوت بنا دے!!! ہائے آں صادق پوری کجا است! و اہل صادق پور بہ کجا اند! نہ مکان را تمکنے، و نہ مکیں را تمکنے! الٰہی ایں چیست[۱]!"

(۲) " پس اگر اس کا کوئی علاج ہے اور ہم کو سوجھتا ہے تو یہی ہے کہ جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی جائے اور اسلام کو عقل کے موافق کر دکھایا جائے، اور اس طرح کہ اسلامی معتقدات بھی قائم رہیں اور تطبیق

---

[۱] تقریظ و تبصرہ، تذکرۂ صادقہ۔ اردو ادب آزاد نمبر۔ صفحہ ۳۴

کی تطبیق بھی ہو جائے" جب یہ بات طے ہو گئی تو پھر یہ دیکھنا ہے کہ ہماری قوم کے وہ سربرآوردہ اصحاب جو اس کام کے اہل ہیں کیوں ایک ناخوشگوار سکوت اختیار کئے ہوئے ہیں، کیا ان کے نزدیک ہندوستان کی مذہبی حالت قابلِ اطمینان ہے، نہیں بلکہ وہ حضرات خود اپنی تحریر و تقریر میں اس کا ذکر کرتے ہیں اور بعض ذی علم وعدہ بھی فرما چکے ہیں کہ ہم چیاں حنیں دہیا کریں گے، مگر ان کا یہ وعدہ کسی معشوق کے وعدۂ وصل کا اثر رکھتا ہے، جس کا ایفا ہونا عشاق کی پرشوق نگاہ میں بالکل غیر ممکن ہے، الغرض جو حضرات اس کام کی قابلیت رکھتے ہیں، انھوں نے سکوت اپنا مسلک قرار دیا ہے، اس لئے مجبوراً ہم نے اس راہ کا سفر اختیار کیا ہے جس کی تکالیف کا تحمل ہم میں نہیں ہے، اور اس دریائے ناپیدا کنار کے طے کرنے کا ارادہ کیا ہے جس کی طاقت ہم میں نہیں ہے[1]۔"

(۳) "آپ جانتے ہیں اور مجھ سے اچھا جانتے ہیں کہ محرکین تعلیم انگریزی کی اشاعت سے کیا غرض تھی، اشاعتِ علوم نہ ہوئی مگر افسوس ہے کہ یہ غرض تو حاصل نہ ہوئی اور انگریزی ذریعۂ ملازمت سمجھ لی گئی، اب نہ کوئی سائنس سے غرض ہے نہ فلسفے سے، بس انٹرنس یا ایف اے تک انگریزی حاصل کی اور ۱۵ روپئے پر ملازم ہو گئے، پس حالت موجودہ کے لحاظ سے اس وقت اس کی بڑی ضرورت ہے کہ اپنی ملکی زبان میں علوم مغربی کا

---

[1] احسن الاخبار یکم جون ۱۹۰۲ء بحوالہ ماہنامہ "سب رس" اکتوبر ۱۹۶۲ء ۔ صفحہ ۲۳

ترجمہ کیا جائے اور سائنٹیفک سوسائٹی اور پنجاب یونیورسٹی کی پالیسی سے اتفاق کیا جائے۔"[۱]

(۴) "ایک زمانہ تھا جب ہم استعجاب کے لہجے میں کہا کرتے تھے کہ کیا گونگے بول سکتے ہیں، جب ضرورت ہوتی تھی کہ قدرت کے ناممکن التبدیل قوانین کی کوئی بین مثال مخاطب کے ذہن نشین کریں تو اس سے بہتر کوئی مثال نہیں ملتی تھی کہ کیا گونگے بھی بول سکتے ہیں، مگر آج علوم کی ترقی، انسان کی جدوجہد اور یورپ کی علمی فیاضی نے ایسے واقعات پیدا کردیئے ہیں کہ ہم یہی واقعہ کہتے ہیں کہ گونگے بھی بول سکتے ہیں۔"[۲]

مندرجہ بالا اقتباسات مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین سے ماخوذ ہیں، ان کے ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ موضوع و اسلوب کے اعتبار سے سرسید کا عکس لئے ہوئے ہیں۔ ان اقتباسات میں نہ تو ابہام ہے اور نہ پیچیدگی، ان میں ایک ہی بات کو کئی کئی جملوں میں دہرایا ضرور گیا ہے مگر اس میں بدمزگی اور بے کیفی نہیں پیدا ہونے پائی ہے، اس کے علاوہ خطیبانہ انداز بیان کی رو مدھم انداز میں تقریباً سبھی اقتباسات میں محسوس کی جاسکتی ہے، دوسرے اقتباس میں ادبی طنز و مزاح کی ایک ہلکی چاشنی بھی موجود ہے، مضمون نگار اس بات سے خاطر خواہ واقف ہے کہ کس رنگ کو کس جگہ شوخ اور کس جگہ مدھم کیا جائے، استدلال، منطقی انداز بیان، خطیبانہ لہجہ، انگریزی الفاظ کا استعمال، تشریحی رجحان، طنز کی چاشنی، ان تمام خصوصیات کی نشاندہی ان

---

[۱] مکتوب بنام حکیم محمد علی خاں ایڈیٹر مرقع عالم ہردوئی بحوالہ اردو ادب آزاد نمبر۔ صفحہ ۸۰

[۲] الندوہ، مارچ ۱۹۰۶ء۔ صفحہ ۲۷

ابتدائی تحریروں میں کی جا سکتی ہے، مگر تعجب اس بات پر ضرور ہوتا ہے کہ عربی و فارسی تراکیب اور اصطلاحات کا وہ ذخیرہ جس کا استعمال مولانا نے الہلال اور تذکرہ کے صفحات پر جا بجا کیا ہے وہ نمایاں طور پر ان تحریروں میں موجود نہیں ہے اور اگر موجود ہے تو وہ نمایاں رجحان نہیں بن پایا ہے۔ اس دور میں سرسید اور ان کے رفقائے کار کے زیر اثر مولانا سادگی اور سلاست کی طرف مائل تھے، اور یہی اس دور میں ان کا غالب رجحان تھا، فارسی اور عربی کی بھاری بھرکم تراکیب و اصطلاحات کا جو استعمال الہلال اور تذکرہ میں ہوا، وہ دوسرے عوامل کا نتیجہ تھا، جن کا تذکرہ اگلے ابواب میں مناسب مقام پر کیا جائے گا، حقیقت تو یہ ہے کہ موضوع زیر بحث خود اپنے مقاصد اور حالات کی بنا پر اسلوب کا رنگ و آہنگ متعین کرتا ہے، علمی و ادبی مضامین کی فضا جس متانت اور سنجیدگی کی متقاضی ہوتی وہ کچھ اور ہے، اور دعوت و عزیمت کے بیان کے لئے دوسرے الفاظ و تراکیب کی تلاش ضروری ہو جاتی ہے، کتاب اللہ کی تفسیر کے لئے جو اسلوب ہے اس میں کتاب دل کی تفسیر نہیں لکھی جا سکتی، خوابیدہ قوم کی پشت پر مارنے کے لئے تازیانے دوسرے کارخانے میں بنتے ہیں اور بیدار قوم کو سلانے کے لئے تنویمی فضا دوسرے طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے، ہر موضوع کا الگ الگ اسلوب ہوتا ہے، مصنف کی قدرت بیان کئی شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے، فضا کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اسٹائل کا لب و لہجہ بھی بدلتا رہتا ہے، اور کامیاب مصنف اس بات پر ہمیشہ دھیان دیتا ہے کہ اس موضوع کی جو فضا ہو اس کو ہر حال میں بحال رکھا جائے، محمد حسین آزاد اپنی ام جادو بیانیوں اور نذیر احمد اپنی تمام شوخیوں اور نکتہ سنجیوں کے باوجود اس فضا

کو برقرار نہیں رکھ پاتے، جس کا مضمون، مواقع اور محل متقاضی ہوتا ہے، سرسید اس رمز سے واقف ہیں، اور ابوالکلام آزاد کو اس کا احساس ہے کہ اپنی انفرادی طرز نگارش کو موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے بدلنے کے باوجود خون جگر اور خلوص نیت کی آمیزش سے برقرار رکھا جا سکتا ہے اور الفاظ کی موسیقی اور مصوری سے اس میں چار چاند لگائے جا سکتے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت مولانا کی ابتدائی تصنیفی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ وہ مضمون ہے جو خواجہ حسن نظامی کی فرمائش پر سنہ ۱۹۱۰ء کے اوائل میں سرمد کی زندگی انھوں نے سپرد قلم کیا ہے، اس مضمون میں مولانا کے اسلوب، ان کی طرز فکر اور ان کے زاویہ نگاہ سبھی کی نشاندہی ہوتی ہے، یہ مضمون ان کے فنی اور فکری تشکیل کے ابتدائی تجرباتی دور کے اختتام کا اعلان ہے، اس مضمون کی پہلی قسط مولانا نے خواجہ صاحب کو روانہ کر دی تھی، جو ان کو مل گئی تھی مگر دوسری قسط جو انھوں نے دو تین دن کے وقفہ کے بعد سپرد ڈاک کی، وہ کہیں ضائع ہوگئی، مولانا ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"مضمون قصداً نا تمام بھیجا تھا کہ بیماری اور سفر کی حالت میں جتنے صفحے قلم سے نکلے انھیں کو غنیمت سمجھ کر بھیج دینا مناسب نظر آیا، تین دن کے بعد پھر کچھ مہلت ملی، تو باقی مضمون مرتب کیا، اور وہ بھی خواجہ صاحب کے نام کلکتہ بھیج دیا۔ بہرکیف اگر ضائع ہو گیا ہے تو اب نہ اتنی مہلت ہے کہ پھر لکھوں اور نہ اس میں اتنی اہمیت ہے کہ دوبارہ وقت صرف کیا جائے، یہ بھی خواجہ صاحب کا اصرار تھا کہ سرمد کے حالات لکھیے ورنہ تاریخ کے سیکڑوں ارباب اجتہاد و تجدید

شکوہ سنج بے التفاتی ہیں کہ انھیں چھوڑ کر سرمد وغیرہ پر کون وقت ضایع کرے[1]"

مگر کچھ دنوں کے بعد مولانا کو دوبارہ سرمد کی یاد آئی اور انھوں نے ۳ رجون ۱۹۱۰ء کو کلکتہ سے خواجہ صاحب کو لکھا:۔

"کہیے تو سرمد کا بقیہ مضمون لکھ بھیجوں، بمبئی سے آتے ہوئے سرمد یاد آ گئے، ان کی رباعیات کا دیوان ساتھ لے لیا تھا، کبھی نظر پڑتی ہے تو خیالات موجزن ہو جاتے ہیں، آپ چاہیں تو قلم بند کر کے بھیج دوں[2]"۔

چنانچہ ۹ رجولائی ۱۹۱۰ء کو مولانا نے یہ مضمون دوبارہ مکمل کر کے خواجہ صاحب کو بھیج دیا، اسلوب بیان کے علاوہ یہ مضمون، مولانا کے ذہنی رجحان پر کافی روشنی ڈالتا ہے، اور اس کے اندر وہ تمام دبی ہوئی چنگاریاں دیکھی جا سکتی ہیں، جو مولانا بعد کی تحریروں خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کے صفحات پر شعلۂ جوالہ بن کر نمایاں ہوئیں، سرمد کی قومیت اور مذہب کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے جس والہانہ انداز میں اسلام کے اس فیضان کا ذکر کیا ہے جس نے رنگ و نسل اور جغرافیائی حد بندیوں کے امتیاز کو ختم کر کے تمام بنی نوع انسان کو ایک حبل متین میں پرو دیا، وہ وہی ہے جس کا اعادہ بار بار تفصیل اور تشریح کے ساتھ تذکرہ اور ترجمان میں ہوا ہے، اسی طرح سرمد کے ابتدائی پیشہ کے سلسلے میں انھوں نے بازارِ حسن و عشق میں متاعِ دل و جاں کی

---

[1] حیات سرمد تنویر پبلشرز، باغ گونگے نواب لکھنؤ، عرض ناشر۔ صفحہ ۳

[2] " " " " " صفحہ ۴

تجارت کا ذکر جس دفور اور ربودگی کے ساتھ کیا ہے، اس کی صدائے بازگشت بار بار الہلال کے صفحات پر سنائی دیتی ہے، عالمگیر کے مقابلے میں دار اشکوہ کے ساتھ ان کی ہمدردیاں واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ مولانا کے نزدیک یہ ہے کہ "اس نے تلاش مقصد میں دیر وحرم کی تمیز اٹھادی تھی اور جس نیازکیشی کے ساتھ مسلمان فقرار کے آگے سر جھکاتا تھا ویسی ہی عقیدت ہندو درویشوں سے بھی رکھتا تھا، کیونکہ اگر اس عالم میں بھی کفر واسلام کی تمیز ہو تو پھر اعمیٰ اور بصیر میں کیا فرق باقی رہ گیا، پروانہ کو تو شمع ڈھونڈھنی چاہیے، اگر صرف شمع حرم ہی کا شیدا ہے تو سوز طلبی میں کامل نہیں"[1]۔

خود مولانا کی پوری زندگی اس باب میں ایک کھلی ہوئی کتاب ہے کہ انھوں نے بھی یوسف مقصد کو پانے کے لئے اسی وسیع النظری اور روشن خیالی کا ثبوت دیا جو دار اشکوہ کے یہاں پائی جاتی ہے، مولانا لکھتے ہیں :-

"عالمگیر کی ہوشیاری سے تو ہمیں دار اشکوہ کی دیوانگی اور جنون ہی زیادہ پسند آتی ہے کہ وہاں تو تیغ ہوشیاری کشتگان حسرت کے خون سے رنگین ہے اور یہاں خود اپنے جسم کے رگ ہائے گردن سے خون کی نالیاں بہہ رہی ہیں، شاید دار اشکوہ بھی عالمگیر جیسے ہوشیاروں کی ہوشیاری سے تنگ آگیا تھا، اسی لئے اس نے سرمد جیسے مجانین کی صحبت کو ہوش مندوں کی مجلس پر ترجیح دی"[2]۔

---

[1] حیات سرمد، تنویر پبلشرز، باغ گونگے نواب لکھنؤ، عرض ناشر، صفحہ ۱۷ - ۱۶
[2] " " " " صفحہ ۱۸ - ۱۷

اسی طرح سرمد کی شہادت کے ضمن میں انھوں نے جبہ پوشانِ شرع کے فقیہانہ جنگ و جدل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو سرسری اشارہ ایشیا کی اس پالیٹکس کی طرف کیا ہے جس نے مذہب کی آڑ میں ہزاروں خون ریزیاں پولیٹکل اسباب کی بنا پر کی ہیں، اور علمائے ظاہر کی تیغ خون آشام کے سلسلے میں جو نتائج اخذ کئے ہیں ان کا ذکر تفصیل کے ساتھ تذکرہ میں بار بار ہوا ہے، مولانا لکھتے ہیں:۔

"اسلام کے اس تیرہ سو برس کے عرصہ میں فقہا کا قلم ہمیشہ تیغ بے نیام رہا ہے اور ہزاروں حق پرستوں کا خون ان کے فتووں کا دامن گیر ہے، اسلام کی تاریخ کو کہیں سے پڑھو سینکڑوں مثالیں کہتی ہیں کہ بادشاہ جب خونریزی پر آتا تھا تو دارالافتا کا قلم اور سپہ سالار کی تیغ دونوں یکساں طور پر کام دیتے تھے، صوفیا اور ارباب طلب پر منحصر نہیں، علمائے شریعت میں سے بھی جو نکتہ بیں اسرارِ حقیقت کے قریب ہوئے، فقہا کے ہاتھوں انھیں مصیبتیں اٹھانا پڑیں اور بالآخر سر دے کر نجات پائی[1]۔"

مجموعی طور پر مولانا کا یہ مضمون جسے خواجہ حسن نظامی نے "مقالاتِ درویشی پر ایک مستانہ اور البیلے خطبہ کے نام سے یاد کیا۔ ہے" ابوالکلام کی طبیعت کے روحانی جھکاؤ اور ان کی منفرد فکری اور فنی تشکیل کا ایک سنگِ میل ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوالکلام کا قلم جو ابھی تک تجربات کی وادی میں تھوڑی تھوڑی دور تک تخلف

---

[1] حیات سرمد۔ صفحہ ۲۰

عوامل اور اثرات کے ماتحت چلتا رہا، اب اس نے اپنی منزل کا تعین کرلیا ہے، اور مصنف نے اس رمز کو جان لیا ہے کہ خواہ موضوع کوئی ہو، جب ادیب خود اپنے خونِ جگر کی آمیزش اس میں کر دیتا ہے تو فن معجزہ بن جاتا ہے، یہ پہلا مضمون ہے جس میں مختلف اثرات و عناصر مصنف کی رگ رگ میں سرایت ہو کر جذب ہو گئے ہیں، اور اس کے دل کی دھڑکنوں اور خون کی روانی میں رچ بس گئے ہیں، اور جب وہ اپنے داخلی احساسات کا ذکر کرتا ہے تو اس کے اسلوب پر دوسرے اثرات سے زیادہ خود اس کے اپنے انفرادی رنگ کا غلبہ نظر آتا ہے۔

(۳)

الہلال کا اجراء

"۱۹۰۶ء کی موسم سرما کی آخری راتیں تھیں جب امرتسر میں میری چشم بیداری نے ایک خواب دیکھا، انسان کے ارادوں اور منصوبوں کو جب تک ذہن و تخیل میں ہیں، عالمِ بیداری کا ایک خواب ہی سمجھنا چاہیے، کامل چھ برس اس کی تعبیر کی عشق آمیز جستجو میں صرف ہو گئے، امیدوں کی خلش اور ولولوں کی شورش نے ہمیشہ مضطرب رکھا اور یاس و قنوط کا ہجوم بارہا حوصلہ و عزم پر غالب آ گیا، لیکن الحمد للہ کہ ارادے کا استحکام اور توفیق الٰہی کا جذبہ ہر حال میں طمانیت بخش تھا یہاں تک کہ آج اس خواب عزیز کی تعبیر عالمِ وجود میں پیش نظر ہے۔"[1]

[1] الہلال، ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء

مولانا نے یہ "خواب" اس وقت دیکھا تھا جب انھوں نے دوبارہ وکیل امرتسر کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی تھی، لیکن چونکہ اخبار کے مالک شیخ غلام محمد مولانا کے پولیٹیکل خیالات سے متفق نہیں تھے اس لئے مولانا دل برداشتہ ہو کر امرتسر سے بھوپال چلے آئے، اس زمانے میں انھوں نے یہ رائے قائم کی کہ جو "مقاصد اب پیشِ نظر ہیں وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتے جب تک ایک طاقتور اور وسیع اہتمام و انتظام کے ساتھ اپنا ذاتی اخبار نہ نکالا جائے اور ذاتی پریس نہ ہو۔"[1]

۱۹۰۸ء میں جب مولانا نے مصر، عراق، شام، ترکی اور فرانس کا سفر کیا، تو اخبار اور پریس کی اہمیت کا اندازہ انھیں اور بھی شدت کے ساتھ ہوا اور یہ وہ زمانہ تھا جب شیخ محمد عبدہٗ جمال الدین افغانی کے ساتھ پیرس سے "العروۃ الوثقیٰ" نکال کر یورپ کے سیاسی حلقوں میں کھلبلی مچا چکے تھے، اور مصر کے سرکاری اخبار "الوقائع المصریہ" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنے اخبار کو اصلاح معاشرہ کا مؤثر ترین حربہ بنا چکے تھے، چنانچہ مولانا لکھتے ہیں کہ:۔

"واپسی کے بعد میں کچھ دنوں تک غور کرتا رہا کہ مجھے کیا طریقہ اختیار اور کیا پروگرام بنانا چاہئے، میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ ہمیں اپنے خیالات کو پبلک تک پہنچا کر اپنی موافقت کے لئے رائے عامہ پیدا کرنا چاہئے، اس لئے ایک اخبار جاری کرنا ضروری تھا..... اسی

---

[1] آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی۔ صفحہ ۳۲۴ ۔ حالی پبلشنگ ہاؤس ۔

ارادہ سے میں نے الہلال پریس قائم کیا[۱]"

یہ تقریباً وہی سبق تھے جو پریس اور صحافت کی اہمیت کے بارے میں جمال الدین افغانی نے شیخ محمد عبدہٗ کو دیے تھے، اور انھیں صحافت کی طرف متوجہ کیا تھا[۲]

مولانا کا یہ "خواب" اس وقت پورا ہوا جب ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو الہلال کا اجرار ہوا اس اخبار کا نام اور ظاہری شکل و صورت مصری صحافت سے مستعار لی گئی تھی، عابد رضا بیدار کی یہ رائے کہ "مصر میں ٹائپ سے چھپنے والے مصور پرچے عام تھے، انھیں میں جرجی زیدان کا الہلال بھی تھا جو نام کے ساتھ پوری ترتیب میں بھی ہندوستانی الہلال کا نمونہ بنا[۳]" اس حد تک تو ضرور صحیح ہے کہ ظاہری شکل و صورت میں مولانا کا الہلال جرجی زیدان کے الہلال کے نمونہ پر تھا لیکن جہاں تک اس کی ترتیب اور اس کی طرزِ فکر کا سوال ہے وہ مصر کے الہلال سے قطعی مختلف تھا۔ جرجی زیدان کے زاویۂ نظر کا انحصار زیادہ تر مستشرقین یورپ کی تحقیقات سے مترجم و مقتبس ہے، اور وہ طرزِ بحث و استدلال و عقائد و نظریات........ تاریخی میں زیادہ تر مؤرخین یورپ کی تقلید کرتا ہے، اور اپنے تمام مطالعہ و نظر سے صرف یہ کام لیتا ہے کہ جس چیز کو آئمۂ فرنگ نے اجتہاداً لکھ دیا ہے، اس کے لئے کوئی نہ کوئی شاہد پیدا کرلے وہ اسلام کے ذخیرۂ قدیم سے واقف ضرور ہے لیکن اکثر مقامات پر

۱؎ ہماری آزادی ـ صفحہ ۲۱ ـ ۲۰

۲؎ مجلہ علوم اسلامیہ ۱۹۶۲ء ـ ۷۰

۳؎ عابد رضا بیدار، آزاد ایک صحافی، اردو ادب آزاد نمبر ـ صفحہ ۳۹ ـ ۱۲۸

واضح سے واضح تصریحات پر بھی اس کی نظر نہیں پڑتی، اور اگر پڑتی ہے تو اس کی مسیحی عصبیت اس کو احقاقِ حق سے باز رکھتی ہے، برخلاف اس کے مولانا کی فکری بنیاد تاریخ اسلام کی تحقیق و تفتیش کے میدان سے مستفیض ہوتی ہے، اور قرآن و دیگر علوم دینیہ کے علاوہ جدید تاریخی و تحقیقی ذخائر بھی ان کے سامنے رہتے ہیں، اس لئے عابد رضا بیدار کی یہ رائے کہ "یہی ترکی اور عربی اخبار الہلال کا پس منظر تھے اور اس کی ترتیب اور تہذیب کا سرچشمہ بھی"[1] محض ایک سرسری رائے ہے اور اس کا اطلاق محض اس کی ظاہری شکل و صورت پر ہو سکتا ہے، بہرحال یہ الہلال ایک ہفتہ وار مصور رسالہ تھا،[2] جس کے دو ابتدائی شمارے (۱۳ر جولائی و ۲۰ر جولائی ۱۹۱۲ء) مظہر الحق نے الہلال الیکٹریکل پرنٹنگ ورکس نمبر ۱۰، مکلاوڈ اسٹریٹ کلکتہ سے شائع کئے تھے، اور بعد میں مولانا نے خود شائع کئے، پہلے شمارے کے صرف ابتدائی دو صفحات ترکی ٹائپ میں چھپے تھے، بقیہ صفحات دوسرے ٹائپ میں تھے، مولانا لکھتے ہیں:-

> "سب سے بڑی مشکل ترکی ٹائپ کی وجہ سے پیش آئی، ...... جب تک کچھ عرصہ اس پر مشق نہ کرلیں، یہاں کے عام کمپوزیٹر کام نہیں کر سکتے، ...... عین وقت پر کمپوزیٹر کام کرنے سے عاجز ثابت ہوئے اور جس قدر کمپوز کیا وہ بالکل غلط اور بے قاعدہ تھا، مجبوراً دوسرے

---

[1] عابد رضا بیدار، آزاد ایک صحافی، اردو ادب آزاد نمبر۔ صفحہ ۱۲۸

[2] الہلال ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء ۔ صفحہ ۲۰، ۲۰ر جولائی ۱۹۱۲ء ۔ صفحہ ۱۶

ٹائپ میں از سرِ نو کمپوز کرایا گیا...... البتہ چونکہ ترکی ٹائپ کا اعلان ہو گیا تھا، اس لئے ابتدا میں دو صفحے بہ شکل نمونے کے خیال سے کمپوز کرائے گئے ہیں[1]۔"

سرورق پر "لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" درج تھا، سالانہ قیمت آٹھ روپے اور ششماہی چار روپے بارہ آنے تھی، یہ سالانہ قیمت وہی تھی جو مصر کے الہلال کی تھی، مدیر مسئول و محرر خصوصی کی حیثیت سے مولانا کا نام، احمد المکنیٰ بابی الکلام الدھلوی درج تھا، طلبا کے لئے سالانہ قیمت صرف چار روپئے بارہ آنے تھی[2]، مگر ۹ راکتوبر ۱۹۱۲ء کے بعد سے یہ رعایت ختم کر دی گئی، مولانا لکھتے ہیں :۔

"نہایت درد اور شرمندگی کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ لوگ دفتر کی اس مال و وقت کی قربانی سے بے جا فائدہ اُٹھانے میں تامل نہیں کرتے، اور اس رعایت کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ ہر شخص اپنے لڑکے یا چھوٹے بھائی بھانجے کے نام اخبار جاری کرالے، کیونکہ وہ طالب علم ہے[3]۔"

اصل میں مولانا نے الہلال کا اجرا محض ایک تجارتی کاروبار اور روزگار نہ شغل کے لئے نہیں کیا تھا وہ اس پرچے کے ذریعے اپنے خیالات اور مقاصد کو عوام تک پہونچانا چاہتے تھے، وہ لکھتے ہیں :۔

---

[1] الہلال ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء صفحہ ۳

[2] الہلال ۲۰ر جولائی ۱۹۱۲ء صفحہ ۱۶

[3] الہلال ۹ر اکتوبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۲

"اگر یہ میرے تمام کام محض ایک تجارتی کاروبار ایک دوکاندارانہ شغل ہیں جن میں قومی خدمت اور ملت پرستی کے نام سے گرم بازاری پیدا کرنا چاہتا ہوں تو قبل اس کے کہ میں اپنی جگہ پر سنبھل سکوں، وہ میری عمر کا خاتمہ کر دے اور میرے تمام کاموں کو ایک دن بلکہ ایک لمحے کے لئے بھی کامیابی کی لذت چکھنے نہ دے[1]"

مولانا نے الہلال کو ظاہری اور معنوی دونوں حیثیت سے معیاری اور اردو رسائل میں ممتاز بنانے کی امکانی کوشش کی۔ ۲۰ جولائی ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں الہلال کی قیمت کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:۔ یہ شمارہ میں

"انگریزی پریس کا نمونہ ... کو سامنے رکھ کر ... اردو زبان میں رسالہ جاری کیا ہے[2]"

مولانا کے سامنے درا صل انگریزی پریس کا نمونہ براہ راست نہ تھا، انھوں نے اپنے پیش نظر مصری اور ترکی اخبارات رکھے تھے، ۱۹۰۸ء کے دستوری انقلاب کے بعد ترکی میں بھی صحافت قدرے آزاد ہو چکی تھی، اور وہاں کے اخبارات و رسائل بھی ترتیب و تہذیب میں مصری نمونہ پر چل رہے تھے، انیسویں صدی کے اواخر ہی میں اخبار کا عام مذاق وہاں پھیل چکا تھا، مولانا شبلی نے اپنے سفرنامہ میں ان قہوہ خانوں کا تذکرہ کیا ہے، جہاں ہمیشہ کثرت سے اخبارات موجود رہتے تھے،

---

[1] الہلال، ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء ۔ صفحہ ۳ [2] الہلال، ۲۰ جولائی ۱۹۱۲ء صفحہ ۱۶
[3] الہلال، ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء ۔ صفحہ ۱۲ ۲

اور اسی وجہ سے ان کو قہوہ خانے کے بجائے قرائت خانہ کہا جاتا تھا، انھوں نے اپنا سفر ۱۸۹۲ء میں کیا تھا حالانکہ اس وقت وہاں اخبارات کو بالکل آزادی حاصل نہیں تھی، پھر بھی رسائل کا معیار بہت اونچا تھا، وہ لکھتے ہیں :۔

"میگزین اور ماہوار رسالے جو ترکی زبان میں نکلتے ہیں نہایت قابل قدر ہیں، ان میں سب سے زیادہ معروف "معارف" ہے جو ہفتہ وار نکلتا ہے، اس رسالے میں ہمیشہ اعلیٰ درجے کے مضامین لکھے جاتے ہیں، اور ترکوں میں آج کل جو لوگ علوم جدیدہ کے ماہر ہیں زیادہ تر اسی رسالہ کے ذریعہ اظہار خیال کرتے ہیں، مضامین زیادہ تر نیچرل سائنس اور آلات جدیدہ کے متعلق ہوتے ہیں[۱]۔"

اسی طرح مصری صحافت کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے :۔

"انگریزی گورنمنٹ کی بدولت یہاں کے اخباروں کو آزادی حاصل ہے، اس لئے یہ اخبارات ہر قسم کے ملکی معاملات پر نہایت آزادی سے لکھتے ہیں، اور خوب لکھتے ہیں...... ماہوار رسالے بھی متعدد ہیں، ان میں "مقتطف" اور "الہلال" زیادہ کامیاب ہیں[۲]۔"

لیکن چونکہ اس وقت کی ترکی اور مصری صحافت یورپ کی صحافت سے متاثر تھی،

---

[۱] شبلی، سفرنامہ مصر و روم و شام، محمڈن پریس علی گڑھ۔ صفحہ ۷۷
[۲] " " " " " صفحہ ۳۰۹

اس لئے مولانا کا یہ بیان کسی حد تک درست بھی ہے کہ ان کے سامنے انگریزی پریس کا نمونہ تھا، ہندوستانی اس وقت بڑی حد تک عربی اور ترکی صحافت سے ناواقف تھے، اور وہ ہندوستان کے انگریزی اخباروں کو معیاری تصور کرتے تھے اس لئے مولانا نے بظاہر انگریزی صحافت کا نام لے کر الہلال کی قیمت کا اندازہ اپنے قارئین کو کرانا چاہا۔

(۴)

سواد و حروف رسالہ کی ظاہری خوبیوں میں مولانا نے اس کے ٹائپ اور اس کی تصویروں پر بار بار زور دیا ہے، ٹائپ سے مولانا کی دلچسپی بہت پرانی تھی، سنہ ۱۹۰۶ء میں انھوں نے ایک (KEY. BOARD) اردو ٹائپ کا بنایا تھا اور مزید اصلاح کے لئے انھوں نے مرزا ہادی رسوا کے حوالے کیا تھا، "مگر یہ ناتمام تھا اور جب بعض الفاظ کے جوڑ ملائے گئے تو ٹھیک نہ اترے، حروف کی صورت بھی پرشین کریکٹر پر قائم نہ رہی، کچھ اور ہی ہوگئی[1]"۔ مولانا پتھر کی چھپائی کو پریس کی نشوونما اور ترقی کے لئے مضر سمجھتے تھے، ۲۰ جولائی سنہ ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں انھوں نے لکھا:۔

"نہیں معلوم کس ظالم نے اول اول پتھر کی چھپائی کی اردو میں بنیاد ڈالی ؎ ہر کہ آمد براں مزید کرد، لیکن خواہ کوئی ہو اس

---

[1] سیرت مرزا ممتاز حسین عثمانی مدیر اودھ پنچ، ماخوذ از کتاب مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات صفحہ ۱۹۳

بے شک نہیں اس نے ہر ایک طرح سے قابل نشو و ترقی پریس کو ایک صدی پیچھے ڈال دیا، اور کم از کم اچھے اخبارات کے نکلنے کا قطعی سدِّ باب ہو گیا[1]۔"

اور اسی لئے انھوں نے اپنا رسالہ ٹائپ میں نکالا، اور اس کے تمام پہلوؤں پر دھیان رکھا۔ اور کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ بہتر ٹائپ فراہم ہو سکے۔ الہلال کے ۲۰ر جولائی ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں ترکی کارخانہ احمد احسان کو تین مختلف نمبروں کے ٹائپ کے لئے آرڈر بھیجے جانے کا حوالہ ملتا ہے۔ "جس کا ٹائپ بدرجہا زیادہ خوش نما اور دخانی فونڈری میں ڈھلنے کی وجہ سے چھپنے میں بالکل جوڑ اور خوشخط لکھے حروف سے اشبہ ہے[2]۔" انھوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ بیروت کے کارخانہ خلیل کے حروف کے لئے بھی آرڈر بھیجنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ "جو ایک مشہور شامی ادیب اور ماہر فن خلیل یازجی کا اصلاح کردہ ٹائپ، اور ایک دوسرا سواد رکھتا ہے[3]۔" ان کارخانوں کے ٹائپ آئے بھی یا نہیں، لیکن الہلال کے بعد کے شماروں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ حروف میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی،، حالانکہ ۲۴ر جون ۱۹۲۷ء کے شمارے میں انھوں نے یہ بھی اطلاع دی ہے کہ "مصر اور جرمنی کا ٹائپ بھی آ گیا ہے، اُمید ہے کہ مزید حسن و زیبائش کا باعث ہو گا، لیکن بہر حال ان تمام اہتمامات سے اس سنجیدگی کا اندازہ ہوتا ہے جو مولانا کے پیشِ نظر الہلال کو صوری

---

[1] الہلال، ۲۰ر جولائی ۱۹۱۲ء۔ صفحہ ۲ [2] الہلال، ۲۰ر جولائی ۱۹۱۲ء۔ صفحہ ۲
[3] الہلال، ۲۴ر جون ۲۷ء۔ صفحہ ۱۲

اعتبار سے معیاری بنانے کے سلسلے میں تھی اُردو کے جس ٹائپ میں الہلال چھپ رہا تھا" اگر غور اور مقابلے کے ساتھ دیکھا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ کلکتہ اور الہ آباد کے تمام اُردو ٹائپوں سے مجموعی طور پر بدرجہا زیادہ خوشنما اور بہتر تھا، اس وقت تمام ہندوستان میں عربی، فارسی اور اردو ٹائپ کی سب سے بڑی فونڈری بیپٹسٹ مشن کلکتہ کی تھی جس میں ایشیاٹک سوسائٹی کی کتابیں چھاپی گئی تھیں، مولانا لکھتے ہیں :-

"ہمارے اکثر ناظرین .... مقابلے کے بعد اندازہ کرسکیں گے کہ الہلال کا ٹائپ سوادخط کے لحاظ سے گو چنداں مختلف نہ ہو مگر اپنی ترکیب اور جوڑوں کے اتصال اور مجموعی زیبائی میں نسبتاً اس سے بدرجہا بہتر ہے[۱]"

ٹائپ کے علاوہ مولانا نے تصویروں پر بھی کافی توجہ صرف کی اور اس بات کی کوشش کی کہ حتی الامکان اصلی فوٹو حاصل کر کے ان کے بلاک تیار کرلیں۔[۲] ۱۴ر اگست ۱۹۱۲ء کے شذرات میں انھوں نے لکھا :-

"ہم نے اوّل تو تصویروں کے بلاک بنانے کا انتظام جس کارخانے کے سپرد کیا ہے وہ تمام ہندوستان میں اول درجے کا کارخانہ ہے، اور یہ کہنا ضروری نہیں کہ کلکتہ سے بہتر ان چیزوں کا انتظام اور کہیں نہیں ہو سکتا۔ پھر اخبار کے لئے بین کے ڈبل کراؤن متین الگ اور مخصوص رکھی ہے اور اس فن

---

[۱] الہلال، ۲۰ر جولائی۔ صفحہ ۳ [۲] الہلال، ۲۰ر جولائی ۱۹۱۲ء

کے جاننے والے جانتے ہیں کہ چھپائی کے نازک کاموں کے لئے اس کارخانے اور اس سائز کی مشین مشہور ہے، ہم نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا اور خاص ہاف ٹون کی چھپائی کی ٹیڈل مشین بھی خریدی، اور بعض تصویروں کو اخبار سے الگ چھاپنے کا انتظام کیا۔[1]

۲۰ راگست ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں پورے صفحے کی آرٹ پیپر پر جب غازی انور بک کی تصویر مولانا نے شائع کی تو یکم ستمبر ۱۹۱۲ء کے شذرات میں انھوں نے لکھا:۔

"تصویر امید ہے کہ ناظرین کے پسند خاطر ہوئی ہو، تاہم ہمارے پیش نظر جو نمونے ہیں اس کے اعتبار سے خود ہم تو اسے شائع کر کے زیادہ خوش نہیں، اگر اخبار کی اشاعت کی طرف سے تھوڑا سا بھی اطمینان میسّر آجائے، تو پھر البتہ ہر نمبر کے دو صفحے پریس کے صنّاعی نمونوں کے لئے مخصوص کر دیں، اور وہ یورپ کے باتصویر رسالوں سے کسی بات میں کم نہ ہوں۔"[2]

ابتدائی جلدوں میں زیادہ تر تصویریں طرابلس کے مناظر اور نامورانِ غزوۂ طرابلس کے متعلق تھیں، یہ سب یکساں طور پر شائع نہیں ہوئی تھیں، ان میں کچھ کے نقوش واضح تھے، اور کچھ کے مدھم، جب الہلال کے قارئین نے مولانا کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو انھوں نے لکھا:۔

---

[1] الہلال، ۲۰ راگست ۱۹۱۲ء۔ صفحہ ۱ [2] الہلال، یکم ستمبر ۱۹۱۲ء۔ صفحہ ۱

"الہلال پریس میں تصاویر اور چھپائی کا جو انتظام کیا گیا ہے وہ انگریزی رسائل کے پریسوں سے کسی بات میں کم نہیں ہے لیکن اگر سرے سے تصویر کی اصلی کاپی ہی خراب ہو تو پریس اس کے لئے کیا کرسکتا ہے ...... اٹالین ذرائع کی تصاویر تو ہزاروں لندن نیوز اسکیچ، اسفیر گریفک وغیرہ میں چھپ چکی ہیں، لیکن جو صحیح تصویریں عثمانی ذرائع سے ملتی ہیں وہ عموماً نہایت بے سروسامانی کی حالت میں کھینچی ہوئی ہیں۔[1]"

حسب بالا اقتباسات اور اسی طرح الہلال کے شماروں میں جابجا بکھرے ہوئے دیگر بیانات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے ظاہری اعتبار سے الہلال کو دیدہ زیب اور جاذب نظر بنانے کی امکانی سعی کی اور وہ اپنے مقاصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے۔ اس لئے کہ اردو صحافت کی تاریخ میں صوری اعتبار سے الہلال نہ صرف پہلے کے اخبارات اور رسائل سے ممتاز رہا بلکہ اپنے معاصرین سے بھی سبقت لے گیا، اس کے ممتاز معاصرین میں مولوی بشیر الدین کا البشیر (اٹاوہ) حکیم برہم کا مشرق (گورکھپور) وحید الدین سلیم کا مسلم گزٹ (لکھنؤ) گنگا پرشاد ورما کا ہندوستانی (لکھنؤ) حکیم محبوب عالم کا پیسہ اخبار (لاہور) ظفر علی خاں کا زمیندار (لاہور) علی گڈھ کا گزٹ، الہ آباد کا مساوات، اور کامریڈ کے علاوہ محمد علی کا روزنامہ ہمدرد قابلِ ذکر اخبارات تھے، اور

---

[1] الہلال، یکم ستمبر ۱۹۱۲ء ۔ صفحہ ۲

حقیقت یہ ہے کہ اپنی ظاہری دیدہ زیبی اور آرائش کے لحاظ سے الہلال ان سب سے بہتر تھا۔

الہلال کے یہ تمام اہتمامات جو مولانا نے کئے وہ یقیناً کثیر مصارف سے ہوئے ہوں گے، اخبارات اور رسائل سالانہ چندہ کے علاوہ اپنے اخراجات کا ایک بڑا حصہ عموماً اشتہارات کے ذریعہ پورا کرتے ہیں، لیکن اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں جبکہ خریداروں کی تعداد نسبتاً کم ہوتی ہے مولانا نے اشتہارات کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کی اور رسالہ کے داخلی صفحات کو اشتہارات سے بچائے رکھا، ابتدائی چند شماروں میں ایک نہایت مختصر سا مقامی اشتہار ہے، اور وہ یہ ہے "عربی، فارسی اور اردو ٹائپ کی اعلیٰ ترین چھپائی کے لئے "دارالطباعت الہندیہ" مستعد ہے" اس کے علاوہ کوئی دوسرا اشتہار بہت دنوں تک نظر نہیں آتا، البتہ ۲۵ر اگست ۱۹۱۲ء کے الہلال میں ایک سمن بغرض انفصال مقدمہ شایع ہوا ہے، جو منصرم کے دستخط سے عدالت منصفی دیوریا، ضلع گورکھپور اجلاس محمد شمس الحسن صاحب سے جاری کیا گیا ہے، مدعی کا نام نرائن داس اور" مدعا علیہ لکھ رام ولد رام چندر متوفی ساکن حال شہر کلکتہ محلہ کالی گھاٹ ملک بنگال ہے" یہ شاید پہلا اور آخری سمن تھا جو الہلال کے صفحات میں شائع ہوا، البتہ مقدمہ کے سلسلے میں ایک اور اشتہار ۷ر اور ۱۴ر جنوری ۱۹۱۴ء کے مشترکہ شمارے قاضی عبدالعزیز نائب تحصیلدار کوئٹہ بلوچستان کی عدالت سے ۲۷ روپیہ ۳ر آنہ کے ایک دعویٰ کے متعلق شایع ہوا ہے جس میں مدعا علیہ روپوش تھا، البتہ بعد کے شماروں

البلاغ اور ۱۹۲۷ء کے شماروں کے کور پر اشتہارات کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی گئی، صرف یہی نہیں بلکہ مولانا نے اس ضمن میں عطیات قبول کرنے سے بھی گریز کیا، ان کا عقیدہ تھا کہ جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی رقم لینا جائز رکھتا ہے وہ اخبار نہیں بلکہ اس فن کے لئے ایک دھبہ اور سرتاسر عار ہے، وہ اخبار نویسی کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض الٰہی ادا کرنے والی ایک جماعت سمجھتے تھے، ان کا نظریہ یہ تھا کہ اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہیئے، اور چاندی اور سونے کا تو سایہ بھی اس کے لئے سمِ قاتل ہے، انھوں نے لکھا:-

"جو اخبار نویس رئیسوں کی فیاضیوں اور امیروں کے عطیوں کو قومی امانت اور قومی عطیہ اور اسی طرح کے فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں، وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور نورِ ایمان کو بیچیں بہتر ہے کہ دریوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر اور قلندروں کی کشتی کی جگہ قلم دان لے کر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر گشت لگائیں اور "ہر گلی کوچہ کام اڈیٹر کا" کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کرتے رہیں۔"[۱]

چنانچہ جب قوم کے ایک مشہور صاحبِ ریاست اور قومی خدمات میں سربرآوردہ بزرگ نے الہلال کا پہلا نمبر دیکھ کر ایک چیک روانہ کیا تو مولانا نے اسے قبول کرنے

---

[۱] الہلال، ۲۷ جولائی ۱۹۱۲ء

سے انکار کر دیا اور بڑی سختی کے ساتھ شذرات میں لکھا :۔

" ہم خاک نشینان بوریا مذلت مسند نشینان عزّ و جاہ کے بذل و عطا کے مستحق نہیں ،....... ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لئے نہیں بلکہ تلاش زیان و نقصان میں آئے ہیں ، صلہ و تحسین کے لئے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلبگار ہیں ، عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈھتے ہیں ، دنیا کے زر و سیم کو قربان کرنے کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے تئیں قربان کرنے آئے ہیں ۔[۱]"

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے مولانا کا منشا ر الہلال کے اجراء سے محض تاجرانہ منفعت حاصل کرنا نہ تھا ، بلکہ وہ ایک ایسا ذریعہ تلاش کر رہے تھے جو عوام سے رابطہ قائم کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتا اور ان کے خیالات کے نشر و اشاعت میں مفید اور کارآمد ہوتا ، جس طرح جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ نے العروۃ الوثقیٰ کے ذریعہ یورپ کے سیاسی حلقوں میں اپنے خیالات کی چنگاریاں بکھیر دی تھیں اسی طرح مولانا بھی اپنی صحافت کو اپنے نظریات کی ترویج و اشاعت کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے ۔

مولانا اپنے ان مقاصد میں کس حد تک کامیاب رہے ، اس کا تفصیلی جائزہ بعد میں لیا جائے گا ، لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ موجودہ زمانے میں پریس اور مطبوعات کی اہمیت کا انھیں خاطر خواہ اندازہ تھا ، انھوں نے لکھا :۔

---

[۱] الہلال ، ۲۷ جولائی ۱۹۱۲ء

"نہ صرف علم وادب کی ترقی کے لئے بلکہ قومی اور اجتماعی زندگی کی نشوونما کے لئے بھی ان کا (پریس، مطبوعات) کا وجود ناگزیر ہے، علم وادب کی صحیح ترقی بجائے خود قوم کے اجتماعی ذہن وفکر کی ترقی ہے۔ جیسی جیسی اس کی سطح بلند ہوگی اتنی ہی قومی زندگی کی سطح بلند ہوتی جائیگی؛ جہاں تک پریس اور صحافت (جرنلزم) کا تعلق ہے دنیا اس قدر آگے نکل چکی ہے کہ اب دس برس بیشتر کی صحافت صدیوں کی پرانی چیز معلوم ہوتی ہے۔ قومی زندگی کی تعمیر کے لئے ایک بنیادی اینٹ زبان ہے زبان کی ترقی کے لئے پہلی چیز اس کی ادبیات (لٹریچر) ہیں، ادبیات کی نشوونما بغیر اعلیٰ درجہ کے رسائل ومطبوعات کے ممکن نہیں[1]۔"

مولانا نے پریس کی یہ اہمیت سرسید اور افغانی کی تحریک سے سیکھی تھی، سرسید نے اپنی تحریک گزٹ اور تہذیب الاخلاق سے شروع کی تھی اور انھوں نے اصلاح کے لئے صحافت کے حربے کا استعمال کیا تھا، افغانی بھی پریس کی اثرپذیری اور وسعت سے اچھی طرح واقف تھے، العروۃ الوثقیٰ کے اجراء کے بہت پہلے مصر میں انھوں نے اپنے دوستوں اور عقیدت مندوں کو اخبار نویسی پر اُبھارا تھا۔ حیدرآباد کے مولانا محب حسین نے جب ان کے مشورہ سے اپنا پہلا پرچہ "معلم شفیق" جاری کیا تھا تو اس کے پہلے ہی شمارے میں افغانی کا ایک مقالہ "فوائد جریدہ"

---

[1] الہلال، ۲۷ر جولائی ۱۹۱۲ء

شائع ہوا تھا، ابوالکلام کی اوّلین تحریروں میں بھی ایک کا موضوع اخبار نویسی ہی تھا، دونوں کے یہاں پریس کی اہمیت کا شدید احساس حیرت انگیز طور پر متوازی ہے، عابد رضا بیدار کا یہ خیال کہ العروۃ اور الہلال کی تحریک زدہ تحریریں بھی حیرت انگیز مماثلت [1] رکھتی ہے، اپنی جگہ پر درست ہے، یہ حقیقت ہے کہ الہلال کے صفحات میں جتنا اور جس طرح افغانی کا ذکر کیا گیا ہے، اتنا کسی اور عظیم اسلامی شخصیت کو یاد نہیں کیا گیا، الہلال کا پہلا ہی شمارہ افغانی اور عبدہٗ کی تصویر لیے سے مزین ہے، یہ ساری مماثلت ہمیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ ہم یہ رائے قائم کریں کہ الہلال کے اجرا میں ابوالکلام کی فکر کا سرچشمہ افغانی، عبدہٗ اور سرسید سے مستفیض ہو رہا تھا، لیکن چونکہ اردو داں طبقہ سرسید کے علاوہ ترکی اور عربی اخبارات سے واقف نہ تھا اس لئے الہلال اپنی ظاہری خصوصیات میں بھی ایک نئی چیز معلوم ہوا۔ اور اپنے معاصرین میں ممتاز رہا۔

لیکن قبل اس کے کہ الہلال کے ماخذ اور اس کی تحریک کا جائزہ تفصیلی طور پر لیا جائے، اور اس کی ادبی وصحافتی حیثیت کا تعین کیا جائے کچھ اور ضمنی اور ثانوی باتیں ہیں، جن کا تذکرہ اسی موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

الہلال تین مرتبہ موت وحیات کی کش مکش سے گزرا، اس کا پہلا شمارہ ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو شائع ہوا اور ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء تک چلتا رہا ایک سال کے بعد اس کا دوسرا جنم ہوا اور ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو البلاغ کے نام سے نکلا اور ۳۱ر مارچ ۱۹۱۶ء تک زندہ رہا۔ گیارہ سال کے بعد ۱۰ر جون ۱۹۲۷ء

---

[1] عابد رضا بیدار۔ اُردو ادب آزاد نمبر۔ صفحہ ۱۳۶

پھر الہلال کو نئی زندگی اور اسی سال ۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔
مالک رام نے اپنے ایک مضمون میں ۱۹۲۶ء میں ایک بار اور الہلال کے اجرا کی خبر دی ہے وہ لکھتے ہیں ۱۹۲۶ء میں اُنھوں نے پھر اسے (الہلال) چھ ماہ کے لئے کلکتہ سے شایع کیا تھا، لیکن بعد میں خیال آیا کہ اسے دہلی منتقل کر دیں، جو زیادہ مرکزی جگہ تھی، حکومت نے ان کے دہلی پہونچنے سے پہلے ہی اپنے ایک حواری کو الہلال ماہانہ اور ہفتہ وار پرچہ شایع کرنے کا ڈیکلریشن دے دیا۔ اس طرح الہلال کا نام ان سے چھن گیا، پھر انھوں نے یہ بھی چاہا تھا کہ اس کا نام "الاقدام" رکھیں لیکن نہ جانے کیوں یہ بیل بھی منڈھے نہیں چڑھی[۱]" مالک رام نے اس بیان کا ماخذ کیا ہے، اس کا پتہ نہ چل سکا اور نہ کسی دوسرے آدمی کی تصدیق اس سلسلے میں مل سکی، خود مولانا کے بیان سے اس بات کی تکذیب ہوتی ہے کہ ۱۹۲۶ء میں بھی الہلال شایع ہوا تھا۔ ۱۰ر جون ۱۹۲۷ء کے الہلال میں وہ لکھتے ہیں کہ:-

> "بحمد اللہ وحدہٗ" الہلال کا پہلا نمبر جون ۱۹۱۲ء میں شایع ہوا تھا اور آخری نمبر نومبر ۱۹۱۴ء میں، پھر نومبر ۱۹۱۵ء سے دوسرا سلسلہ اشاعت البلاغ کے نام سے شروع ہوا اور مارچ ۱۹۱۶ء میں ختم ہو گیا اب یہ تیسرا سلسلہ اشاعت ہے جو کامل گیارہ برس کے بعد از سرِ نو شروع ہوتا ہے[۲]"

تیسرے دور کا الہلال مسعود حسن زبیری نے البلاغ پریس ۱۱ بالی گنج سرکلر روڈ

۱؎ صبا آزاد نمبر۔ صفحہ ۴۲

۲؎ الہلال ۱۰ر جون ۱۹۲۷ء

کلکتہ سے چھاپ کر شایع کیا تھا، اس بار ایک پرچے کی قیمت ۵ر آنہ، سالانہ چندہ بارہ روپئے، ششماہی سات روپئے اور ہندوستان کے باہر کے لئے سولہ روپئے تھا، اور اشتہارات کی تعداد میں بھی خاصہ اضافہ کر دیا گیا تھا۔ ۱۰ر جون ۱۹۲۷ء کے پہلے شمارے میں مولانا نے لکھا:۔

"یہ عجیب بات ہے کہ ۱۹۱۶ء کے اواخر سے لے کر گذشتہ ستمبر تک کوئی بھی خیال میرے ذہن میں اس قدر بعید نہ تھا جس قدر الہلال کی سہ بارہ اشاعت اور اس کی ذمہ داریاں قبول کرنے کا خیال تھا، میری شخصی زندگی اور اس بات کی احتیاجات نیز قومی اور علمی مقاصد اور ان کا مقتضا، دونوں اس بات کے مخالف تھے کہ الہلال جیسے رسالہ کی ہفتہ وار اشاعت کی ذمہ داری تیسری مرتبہ اپنے اوپر لیتا، جہاں تک میری شخصی حالت کا تعلق ہے، سب سے پہلا سوال صحت کا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ روز بروز کمزور ہو رہی ہے...... قومی اور علمی مقاصد کا یہ حال تھا کہ بعض اہم تصنیفات کی تکمیل و اشاعت عرصہ سے ملتوی چلی آتی تھی[۱]"۔

بہر حال الہلال شایع ہوا اس مرتبہ سولہ صفحات ٹائپ میں اور باقی لیتھو میں تھے سرورق بالکل سادہ تھا، اس پر صرف الہلال، البلاغ پریس کلکتہ، قیمت فی پرچہ ۵ر آنے درج تھی، ایڈیٹر کا نام بھی سرورق اور اندر کے پہلے صفحہ پر

۱۔ الہلال، ۱۰ر جون ۱۹۲۷ء

غائب تھا، البتہ آخری صفحہ کے اندر کی طرف، انگریزی رسم الخط میں پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کا نام چھپا ہوا تھا، اور وہ بھی نمایاں نہیں ۱۹۲۲ء میں رہا ہونے کے بعد مولانا "فراغت و کتابے و گوشۂ چمنے" کے مشتاق تھے وہ لکھتے ہیں کہ :-

"خیال تھا کہ جوں ہی وقت کی سیاسی مشغولیت مہلت دے گی پہلا کام یہ کروں گا کہ چار پانچ سال کے لئے کسی ایسے گوشے میں کہ صحت کی درستگی کے لئے سود مند اور پسندیدہ رفقائے علم و عمل کی موجودگی سے دل پسند ہوگا مقیم ہو جاؤں گا اور اپنے پیش نظر علمی و عملی مقاصد کی مشغولیت و تکمیل کے سوا اور کسی کام سے علاقہ نہیں رکھوں گا ...... لیکن عام طور پر لوگوں کی طلب الہلال کے لیے تھی"[1]

لیکن سیاسی مشاغل تھے کہ دن بہ دن بڑھتے ہی چلے گئے، پھر بھی سیاسی زندگی کی سرگرمیاں مولانا کے لئے کیسی ہی سخت کیوں نہ رہی ہوں ان کے ذہن و فکر کی مشغولیتوں میں کبھی خلل نہ ڈال سکیں، وہ خود لکھتے ہیں :-

"علم کا استغراق اور سیاست کی خود فروشیاں دنیا کے لئے متضاد ہوں تو ہوں لیکن میرے لئے تو ایک ہی دماغ کا سودا اور ایک ہی دل کی تپش تھی ؎ "روئے دریا سلسبیل و تعر دریا آتش است" جہاں تک بن پڑا آب و آتش کی اس یک جائی اور برق و خرمن کی اس ہم آمیزی میں کوتاہی کبھی نہ ہوئی"[2] چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اگر

---

[1] الہلال، ۱۰ جون ۱۹۲۷ء

[2] الہلال، ۱۰ جون ۱۹۲۷ء

۱۹۱۲ء میں الہلال ضروری تھا تاکہ مقصد و عمل کی مسدود راہ قوم پر کھول دے تو ۱۹۲۷ء میں بھی وہ کم ضروری نہیں ہے، تاکہ سفر کی سب سے بڑی نازک اور پُرخطر منزل میں وقت کی رہنمائی کرسکے[1]۔"

(۵)

الہلال کی ضمانت

۱۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو پریس ایکٹ کے ماتحت الہلال سے دو ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کی گئی، الہلال کو اس وقت تک پوری آزادی کے ساتھ اپنے مقاصد کی انجام دہی میں تقریباً ڈیڑھ سال کا زمانہ ہوگیا تھا، یہ جرم عشق کی پہلی تعزیر تھی، جسے مولانا کو بھگتنا پڑا، انھیں حکم ملا کہ ۲ ستمبر تک یہ روپیہ داخل کردیا جائے، مولانا لکھتے ہیں :۔

"مگر آج ہی کہ ۲۳ ویں تاریخ ہے دو ہزار روپے کے گورنمنٹ ضمانتی کاغذ عدالت میں بھیج دیے گئے ہیں، ضمانت کا روپیہ تو اسی اسی تاریخ سے بطور ایک سرکاری امانت کے علاحدہ رکھ دیا گیا تھا جس دن الہلال پریس کا ابتدائی سامان خریدنے کے لئے ہم نے روپیہ نکالا تھا، سچ یہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم اکتا گئے تھے، اور اب تو وہ وقت آگیا تھا کہ اگر کوئی مانگنے

---

[1] الہلال، ۱۰ جون ۱۹۲۷ء

کے لئے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کرنے کے لئے آگے بڑھتے[1]۔"

مولانا کی خودداری، انانیت، انفرادیت، کم آمیزی اور احساس برتری جوان کی عقلیت کی پروردہ تھی اس واقعہ میں اپنے لئے امتیاز خاص کا پہلو نکال لیتی ہے اور ان کے قلم سے ایسے ایسے جملے نکلتے ہیں جو سرفراز عقلیت کے سانچے میں ڈھلے ہوتے ہیں،

"ہم نے اتنی سطریں بھی بہ مجبوری لکھیں کہ بیشمار خطوط اور تاروں کا فرداً فرداً جواب دینا ممکن نہ تھا۔ ورنہ ہم اس طرح کے واقعات اس درجہ اہم نہیں سمجھتے ہیں کہ ان کے پیچھے زیادہ صرف کیا جائے، یہ اس طرح کی معمولی باتیں ہیں جو آج کل کے پریسوں کے دفتروں میں ہمیشہ پیش آتی رہتی ہیں، ہمارے سامنے تاریخ نے جو مواد رکھ دیا ہے وہ ہمارے لئے کافی ہے، ایسی باتیں ہمیشہ ہوئی ہیں اور ہوتی رہیں گی اور نتیجہ بھی ہمیشہ یکساں نکلا ہے اور نکلے گا، جو لوگ اس راہ میں قدم رکھتے ہیں جب ان کے سامنے آخری منزلیں موجود ہیں تو ان ابتدائی منزلوں کے پیش آنے پر کیوں شاکی ہیں[2]۔"

البتہ اس تعزیر کے بعد ان کا ذوقِ گنہ کچھ اور زیادہ بڑھ گیا، اور اس حادثہ نے انڈین پریس ایسوسی ایشن کی تاسیس کا تخیل ان کے دل میں پیدا کیا، انھوں نے لکھا:۔

---

[1] الہلال، ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء

[2] الہلال، ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء

"بریت کی سعی عدالت کے اندر کی جاتی ہے، اور اپنی وفاداری کا یقین وہاں دلایئے جہاں صرف غیر وفاداری ہی جرم ہو، لیکن پریس ایکٹ کا دیو ناصرف غذا چاہتا ہے، اس کو غذا کی قسم سے بحث نہیں، پھر اختیار غیر محدود، مرافعہ کا دروازہ مقفل، اور وفاداری و بے وفائی، امن پسندی و بغاوت، خیر خواہی و بدخواہی، حق گوئی و کذب پسندی، کوئی حالت ہو، اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو روکنے کے لئے کوئی پناہ نہیں۔[1]"

چنانچہ "آیندہ کے تحفظ اور ملک کو استبداد فکر و تقید لسان وخیال کی تحقیر سے بچانے کے لئے" مولانا نے وہ تمام روپے قبول کر لئے جو ہمدردان الہلال نے انھیں ضمانت کی خبر سننے کے بعد بھیجے اور اسے انڈین پریس ایسوسی ایشن کے ابتدائی اور تاسیسی کاموں کے لئے منتقل کر دیا، اور لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اس کام میں پورا حصہ لیں، انھوں نے واضح طور پر لکھا:۔

"الہلال اور پریس ایکٹ کا سوال بالکل اسلام اور پریس ایکٹ کا سوال ہے....... الہلال اپنے ہر خیال کو خواہ وہ کسی موضوع سے تعلق رکھتا ہو محض اسلامی اُصولوں کے ماتحت ظاہر کرتا ہے اور کوئی آواز ایسی بلند نہیں کرتا جو اسلام کے قانون اور دستور العمل یعنی قرآن کریم سے ماخوذ نہ ہو...... پھر اگر الہلال پریس ایکٹ کی دفعات

---

[1] الہلال، یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء

کے تحت میں آسکتا ہے تو ہم کو اس دن کا منتظر رہنا چاہیے ۔ جب پریس ایکٹ کی دفعہ ۱۲ کے بموجب "قرآن کریم" نامی ایک کتاب کا بھی سوال پیدا ہو جائے گا، اور برطانوی قوانین کا یہ عجیب الخلقت فرزند اپنے سامنے صرف الہلال کے دار الاشاعت ہی کو نہیں بلکہ چالیس کروڑ پیروانِ قرآن کو پائے گا جو اس کی ہر دفعہ کے بموجب مجرم ہوں گے اور ہر شخص کے ہاتھ میں ایک حکم نامہ ہوگا جس میں لکھا ہوگا "سات دن کے اندر دو ہزار روپیہ داخل کردو"۔[۱]

انھوں نے آگے چل کر لکھا :۔

" زمیندار اور الہلال کا اب تذکرہ لاحاصل ہے، مرض عالمگیر اور سیلاب ہر طرف رواں ہے .... جو حالات نظر آرہے ہیں ان کی پیشین گوئی مستقبل کے متعلق موجودہ حالت سے کہیں زیادہ مخدوش ہے۔ جب روزانہ حبل المتین کلکتہ کو بھی پریس ایکٹ سے پناہ نہ ملی، جس نے موجودہ اسلامی جوش و حرکت میں حصہ لینے کا کوئی جرم نہیں کیا، محض واقعات و اخبار کی اس کے ذریعہ شہر میں اشاعت ہو جاتی تھی، تو پھر ظاہر ہے کہ اوروں کو شکوہ و شکایت کا کیا موقع؟......

اب وقت آگیا ہے کہ ملک کا تمام تعلیم یافتہ اور حق پسند طبقہ اپنی متحدہ قوت سے اس کا قانوناً مقابلہ کرے اور استبداد مطلق العنانی

۱۔ الہلال، یکم اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء

کے اس دھبہ سے اپنی گورنمنٹ کا دامن پاک کردے...... اگر ایک ایسی انجمن قائم ہوگئی تو اس کے ذریعہ ہندوستانی پریس کی ہر شاخ کو تقویت پہونچ سکے گی، اور پریس ایکٹ کے سوال کو اس زور و قوت کے ساتھ اٹھایا جاسکے گا جو یقیناً کسی آخری فیصلہ تک ملک کی رہنمائی کرے گا...... ادارۂ الہلال بکمال تشکر و امتنان ...... اعانت قبول کرنے کے لئے مستعد ہوگیا ہے کیونکہ در حقیقت زردنی "انجمن دفاع مطابع ہند" کے فنڈ کی بنیاد ہوگی[1]۔

مولانا کی اس تجویز سے کہ پریس ایسوسی ایشن کا قیام ہو، بابو سریندر ناتھ بنرجی اور بابو موتی لال گھوش ایڈیٹر امرت بازار پتریکا نے اتفاق کیا اور ۲۲ر اکتوبر ۱۹۱۳ء کو دو بجے ایک جلسہ انڈین ایسوسی ایشن ہال کلکتہ میں قرار پایا۔ جس کی صدارت سریندر ناتھ بنرجی نے کی اور یہ طے کیا گیا کہ نومبر میں ایک جلسہ ہو اور تمام امور مہمہ کے متعلق وسائل و ذرائع عمل اختیار کئے جائیں۔ اس جلسہ کے اہتمام کے لئے جو کمیٹی بنی اس میں مولانا ابوالکلام کے علاوہ سریندر ناتھ بنرجی ایڈیٹر بنگالی، کرشنو کمار متر ایڈیٹر سنجیوتی، موتی لال گھوش ایڈیٹر امرت بازار پتریکا، مولوی مجیب الرحمٰن ایڈیٹر مسلمان، مولوی محمد اکرم ایڈیٹر محمدی اور ایڈیٹر بھارت متر شامل تھے، اور اس طرح ضمانت کا یہ واقعہ ایک روشن خیال ادارہ کے قیام کا پس منظر بن گیا۔

---

[1] الہلال، یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء

۶

البلاغ الہلال سے پہلے دو ہزار اور بعد کو دس ہزار کی ضمانت طلب کی گئی نتیجہ میں وہ بند ہوگیا اس کے بند ہونے کی تاریخ سے لے کر البلاغ کے اجرا کی تاریخ تک کی تمام مدت التوا و انزوا، انتظار و اضطرار، اعتماد و انکار، اور مواعید و اعلان کی ایک دلچسپ اور وسیع مدت تھی مولانا لکھتے ہیں:-

"بلاشبہ یہ گذشتہ ایک سال چند ہفتوں کی مدت دنیا کا کوئی عظیم الشان واقعہ نہیں ہے اور اگر اسے محدود کرنے پر آیئے تو وہ بہت کچھ سمٹ بھی سکتا ہے جس طرح کوشش کرنے پر بہت کچھ پھیل بھی سکتا ہے، تاہم میں سوچتا ہوں تو طرح طرح کی عبرتوں سے اس کی پوری راہ پُر ہے اور محض شخصی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ جماعتی اثرات و علائم اور نتائج و عواقب کے لحاظ سے کتنی ہی غور طلب بصیرتیں اور ایمان پرور عبرتیں اس کے گوشے گوشے میں بکھری ہوئی ہیں[1]:-

بہرحال بصائر و عبرت کی یہ منزلیں ۱۲ رنومبر ۱۹۱۵ء کو ختم ہوگئیں اور البلاغ جاری ہوگیا، اس وقت مولانا نے دارالارشاد کے اجرا، رفتار تصنیف و تالیف کی غیر معمولی تیزی، ترجمۃ القرآن اور تفسیر کی ترتیب و اشاعت اور دیگر اسباب و موانع کے ہجوم میں اسی کو غنیمت سمجھا کہ کسی نہ کسی طرح سے یہ پرچہ جاری ہوجائے

---

[1] البلاغ، ۱۰ر دسمبر ۱۹۱۵ء ـ صفحہ ۲

مولانا لکھتے ہیں :۔

"بہرحال رسالہ تو جاری ہوگیا، مگر اب تک لکھنے کا موقع بالکل نہیں ملا، ابتدا کے دو نمبروں کے تمام ابتدائی صفحات عربی کے خطبۂ افتتاحیہ نے لے لیے اور وہ نہایت اہم اور ضروری مطالب جن کے لئے فواتح سنین ماضیہ کی طرح اردو کے ایک مبسوط و مستقل فاتحۂ البلاغ کا لکھنا ناگزیر ہے، اب تک انضباط و تحریر سے محروم ہیں، اسی طرح وقت کے بعض مسائل مہمہ ہیں جن کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری ہے۔ از اں جملہ "مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن" کا گذشتہ اجلاس علی گڈھ اور خود موضوع "رد و قبول یونیورسٹی" اور اس کے بعض حوالی و اطراف ایسے مواضع نظر و انکشاف ہیں جن سے کسی طرح قطع نظر نہیں کیا جا سکتا۔"[۱]

لیکن ان موضوعات پر خامہ فرسائی کرنے کے قبل مولانا نے الہلال کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر اس بات کا پرزور اعادہ کیا ہے کہ وہ اخبار نویسی کے میدان میں تجارتی عوض و بدل کے لئے نہیں آئے ہیں، بلکہ ان کا مقصد دعوت ہے، جس کا پہلا عقیدہ ایثار و قربانی ہے، اور نقد و متاع کی فراہمی کے بجائے "نفع عام" ہے اور طلب بے زری ان کا مقصد ہے۔ الہلال کی مقبولیت اور کامیابی نے ان کے اندر ایک طرح کا "مغرورانہ احساس" اس زمانے میں پیدا کر دیا تھا، اور ان کی انفرادیت کا لب و لہجہ پرجوش آوازیں بولنے لگا تھا،

۱۔ البلاغ، ۱۰ دسمبر ۱۹۱۲ء۔ صفحہ ۲

انھیں اس بات کا اعتماد تھا کہ "جو کچھ اب تک زبان و قلم کے حوالے ہوا، وہ اس کے مقابلے میں کہ اُبلتے ہوئے چشمے اور بھڑکتے ہوئے شعلے کی طرح سینہ میں جوش زن ہے، علم اللہ کہ ایک قطرہ دریا، اور ذرہ صحرا سے زیادہ نہیں، علی الخصوص قرآن حکیم اور علوم و معارف نبویہ کے متعلق تو یقین کرنا چاہئے کہ اب تک ہزاروں میں سے ایک بات بھی جی بھر کر کہہ نہ سکا" اور "جو کچھ کہا گیا اس کے لئے بھی اے صد ہزار حسرت و داغ، کہ نہ تو بقدر شوق وسعت گفتار پائی، اور نہ بقدر ہمت سامان و وسائل ہی ہاتھ آئے"...... وہ علیم و حکیم ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے اپنے فضل مخصوص سے گذشتہ چھ سات سالوں کے اندر نہ صرف قرآن حکیم بلکہ تمام علوم اسلامیہ کے درس و بصیرت کے کیسے کیسے غیر مفتوح دروازے اس عاجز پر کھولے ہیں، اور کشف اسرار و خفایائے محجوبہ، و تفحص حقائق و معارف مستورہ، و تحقیق غرائب و نوادر، و فیصلہ مذاہب و مشارب، و تطبیق اختلافات متضادہ، و انشراح بصائر و نوادر مخصوصہ کی کیسی کیسی عجیب و غریب نعمتیں عطا فرمائی ہیں؟ علی الخصوص یہ انعام جلیل اور فیض عظیم کہ اختلافات مذاہب و مشارب اور محدثات علوم و مسائل کی تقریباً ہر شاخ میں سلف صالح کے مذہب و مشرب کو اس عاجز پر منکشف کر دیا"[1]

اسی کے ساتھ ساتھ ان کو اس بات کا شدید غم تھا کہ "قرآن حکیم کی تعلیمات کریمہ کے جو حقیقی معارف و بصائر تھے اور جن مقاصد عظمیٰ کے لئے اس کا نزول ہوا تھا وہ صدیوں سے بالکل بھلا دئے گئے ہیں اور یقیناً وہ وقت آ گیا ہے، جس کی

---

[1] البلاغ، ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء - صفحہ ۱۵

نسبت کہا جاتا تھا کہ قرآن کے انوار و برکات زمین سے اُٹھا لئے جائیں گے اور جب لوگ تلاوت کے لئے صحائف کھولیں گے تو اس کے اوراق کو بالکل سادہ غیر منقوش پائیں گے[1]؛ لفظی معنوں میں یہ بات صحیح رہی ہو یا نہ رہی ہو لیکن یہ حقیقت تھی کہ قرآن کے معانی و معارف سے دلوں کے صفحات یقیناً سادہ رہ گئے تھے مسلمانوں کی پستی اور زبوں حالی کے جو اسباب و علل تھے، وہ مولانا کے الفاظ میں علماءِ حق و مرشدین صادقین کا فقدان اور علماءِ سوء مفسدین و جاہلین کی کثرت[2] کے علاوہ کچھ نہ تھے اور اس کا علاج صرف یہ تھا کہ وہی طریق کار اختیار کیا جائے جس سے اسلام کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی اور وہ طریق کار اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ قرآن کریم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ و اشاعت کی جائے، اِن کا عقیدہ تھا:۔

"لا اصلاح الا بالدعوۃ، ولا دعوۃ الا الحجۃ، ولا حجۃ مع بقاء التقلید، فاغلاق باب التقلید الاعمیٰ و فتح باب النظر و الاستدلال ھو مبدا کل اصلاح و مفتاح النجاح والفلاح[3]"

چنانچہ انھوں نے اسی دعوت کا البلاغ کو ترجمان بنایا۔ اس دعوت کی بنیاد حجت و دلیل پر تھی، کورانہ اور اندھی تقلید سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا وہ تقلیدی عقائد پر ضربِ شدید لگانا چاہتے تھے، اور نظر و استدلال کے دروازے

---

[1] البلاغ، ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء - صفحہ ۱۵ [2] البلاغ، ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء - صفحہ ۱۶
[3] " " " صفحہ ۴ ب

کھولنا چاہتے تھے، اس لئے کہ یہی طریق کار ان کے خیال میں تمام اصلاح کا مدار تھا، وہ چاہتے تھے کہ تمام علوم اسلامیہ مثلاً حدیث، فقہ، اصول، کلام بلاغت تاریخ وغیرہ کے ایسے مبسوط اور حاوی درس دیئے جائیں جن سے ان علوم کی تاریخ مختلف تغیرات و ترقیات، عہد بہ عہد کی تبدیلیوں، ان کے اہم مباحث و مسائل اختلافات و محاکمات اور نتائج و بواعث پر لوگوں کے اندر مجتہدانہ و محققانہ نظر پیدا ہو جائے، یہ وہی وقت تھا جب مولانا نے البلاغ کو اپنے نظریات کا آرگن بنانے کے علاوہ دارالارشاد کا بھی قیام کیا تھا اور ترجمان القرآن کے اشتہارات شائع کر رہے تھے، ان کو اپنے مقصد اور مشن سے اتنا عشق تھا کہ اس کے نشر و اشاعت کے لئے ہر ممکن جد و جہد وہ کر رہے تھے، ان کی تقریریں، تحریریں، اعمال و افعال سب اسی مرکز کے گرد چکر کر رہے تھے، اس راہ کی دشواریوں کا کچھ تجربہ ان کو ماضی میں ہو چکا تھا، اور نہ آیندہ کے خطرات سے بھی وہ واقف تھے مگر مقصدیت کا سوز دروں خطرات کی آگ میں بھی گلزار ابراہیم کا مزہ پا رہا تھا، وہ لکھتے ہیں:-

> "مجھ کو، میرے نفس کو، میرے وجود معین کو، میرے نفس خاص کو (خدا کا پیار اور عشق) اسی وقت مل سکتا ہے، جبکہ اس راہ فنا فرمائے دعوت میں مضطربانہ و والہانہ دوڑوں، پھولوں کی سیج سے اٹھوں اور کانٹوں کے اوپر لوٹوں، لعل و جواہر کو پھینکوں اور آگ کے انگاروں سے کھیلوں، خود اپنے ہاتھوں سے اپنی آسائش و راحت کے گھر کو جلا دوں، خود اپنے ہاتھوں اپنے مال و متاع کو غارت گروں کے حوالے کر دوں، لینے سے بھاگوں اور کھونے سے عشق کروں [illegible] معیطی

سے دشمنی کروں اور دست سائل کے لئے بچھا دوں، اپنے آپ کو مٹا دوں، اپنے آپ کو کھو دوں، اپنی آنکھوں کو ہمیشہ خوں بار رکھوں، اپنے جسم کو ہمیشہ زخموں سے چور دیکھوں، اپنے ایک ایک زخم سے خون کی ندیاں بہا دوں، پھر اس پر بھی بس نہ کروں اور اگر اس محبوب حقیقی، اس شاہد یکتا کی ایک چشم مہر، اک نگہِ عشق پرور، ایک تبسم جاں نواز، ایک ادائے قبولیت بھی مل سکے تو سولی کے تختوں کا طواف کر دوں، جلاد کے ہاتھوں کو بوسہ دوں، آب شمشیر کو آب زلال حیات سمجھوں[1]"

جذبات و الفاظ کا یہ جوش، مقصدیت کے نشہ میں چور، ایک ذات کا یہ رقص حیات اس دور کے ابوالکلام کا واضح اور نمایاں رنگ ہے۔ غرضیکہ البلاغ کے بنیادی مقاصد تقریباً وہی تھے جو الہلال کے تھے، جس کا تذکرہ کسی اور مقام پر کیا گیا ہے۔ البتہ اس زمانے میں مولانا خارجی اور داخلی افکار و حالات کا اس قدر شکار رہے کہ انھوں نے ۱۴، ۲۱، ۲۸ جنوری کے مشترکہ شمارے میں اس بات کا خود اعتراف کیا کہ "اب تک یہ حال رہا کہ البلاغ کی تحریر و ترتیب میں میرے لئے وہ لذت و کیفیت ہی نہ تھی، جو اپنے ذوق و شوق کے تمام کاموں میں پاتا ہوں اور جو اگر مجھ سے چھین لی جائے تو میری قوتِ شغل و عمل یکسر ہلاک ہو جائے، اسی کا نتیجہ ہے کہ نہ تو البلاغ کے کسی نمبر کو اس کی اصلی ترتیب و تقسیم کے مطابق تیار کیا گیا اور نہ تمام ابواب و فصول ہی تیار ہو سکے، اور نہ پیشِ نظر مطالب مہم کے لئے زبان کھلی،

---

[1] البلاغ، ۱۷، ۲۴ دسمبر ۱۹۱۵ء

صرف یہی خیال سامنے رہا کہ کسی نہ کسی طرح البلاغ مرتب ہو کر نکل جائے اور وہ سلسلہ برابر جاری رہے۔" مگر یہ کبھی مولانا کا محض ادعا ہی رہا، اس لئے کہ رسالہ پابندیٔ وقت سے نہ نکل سکا تھا اور اسی لئے گذشتہ ۱۷ر اور ۲۴ر دسمبر ۱۹۱۵ء کا شمارہ مشترکہ نکلا تھا مگر اب مولانا نے اعلان کیا کہ ان کے دل کی افسردگی کا موسم اب ختم ہو گیا ہے کہ اور وہ مستعد ہو گئے ہیں کہ ذوق و انہماک کے ساتھ وقت پر البلاغ شایع کریں، اور مضامین کو طرز تحریر و انتخاب مباحث کے اعتبار سے دو بڑی قسموں میں منقسم کر دیں چند مضامین نہایت آسان و سہل زبان اور تمام دقیق مطالب و علمی اشارات سے معریٰ ہوں تاکہ ہر شخص ان سے دلچسپی حاصل کر سکے اور چند مضمون مخصوص طور پر اہل علم و نظر ہی کے لئے ہوں، مگر آئندہ کے شمارے بھی وقت سے نہ نکل سکے، ۲۸ر جنوری اور ۴ر فروری ۱۹۱۶ء، ۳ر اور ۱۰ر مارچ ۱۹۱۶ء، ۱۷ر، ۲۴ر اور ۳۱ر مارچ ۱۹۱۶ء کے شمارے مشترکہ نکلے، اور جب ۲۸ر مارچ کو گورنمنٹ بنگال کے حکم زیر دفعہ ۳ ڈیفنس ایکٹ کے ماتحت ان کو بنگال کے حدود کے باہر جانے کا حکم ملا تو یہ مالہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

البلاغ کے پورے دوران اجرا میں مولانا نے بار بار "عہد التواء و انتظار" کے عنوان سے شذرات لکھتے ہوئے تکرار کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ وہ "داعی" ہیں "تاجر" نہیں ہیں اور خلاف فطرت نے ان کو تجارت کی

لہ البلاغ نمبر ۱۲/۲۱، ۲۸ر جنوری ۱۹۱۶ء - صفحہ ۱

کوئی چھوٹی سی چھوٹی استعداد نہیں دی ہے، ان کی دنیا تجارت گاہ سود و زیاں سے اس قدر دور ہے کہ اگر وہ خود چل کر وہاں جانا بھی چاہیں تو نہیں پہونچ سکتے۔ انھوں نے لکھا:۔

"بلاشبہ میں نے پریس کھولا اور یقیناً میں نے ایک رسالہ جاری کیا لیکن یہ صرف اس لئے کیا کہ اظہار خیال اور تبلیغ مقصد کا اس سے بہتر اور زود عمل طریق اور کوئی نہ تھا، اور میرے پاس اتنی دولت نہ تھی کہ میں مفت چھاپ کر تقسیم کیا کرتا پس میرے تمام کاموں کی بنیاد تبلیغ ہے نہ کہ تجارت، میری اخبار نویسی کو تم اخبار نویسی نہ قرار دو کیونکہ میں نے ضمناً اختیار کیا ہے، اور وہ میرا اصلی کام نہیں ہے، میں نے اگر اسے اختیار کیا تو یہ ہندوستان کی اخبار نویسی اور مطبوعہ اشاعت کے لئے بہتر ہوا اور اس کے لئے ترقی کی ایک بالکل نئی راہ کھلی[1]۔"

اسی بات کی تکرار ۱۷، ۲۴ اور ۳۱ مارچ کے مشترکہ شمارے میں انھوں نے زیادہ تفصیل کے ساتھ کی ہے اور اپنے کاموں کا جائزہ لیا ہے، یہ وہ وقت تھا جب ۲۸ مارچ کو چار دن کے اندر کلکتہ چھوڑنے کا حکم ان کو مل چکا تھا وہ لکھتے ہیں:۔

"ابتدا ہی سے اس عاجز نے تمام نام نہاد سیاسی تعلیمی اور قومی تحریکوں سے الگ ہو کر صرف دعوت و تبلیغ اسلامی و قرآنی کی صراطِ مستقیم

---

[1] البلاغ، ۱۴، ۲۱، ۲۸ جنوری ۱۹۱۶ء۔ صفحہ ۱

کو اپنا شعار و دستور العمل قرار دیا، اور ایک ایسے عہد ضلالت میں
میں جو طرح طرح کی آوازوں سے گونج رہا تھا سب سے پہلے
" اجیبو داعی اللہ " کی صدا بلند کی، نیز اس گم شدہ حقیقت
کو آشکارا کر دینے کی توفیق پائی کہ مسلمانوں کی نجات و فلاح نہ تو
محض دعوتِ تعلیم میں ہے نہ دعوت قومیت و سیاست میں، نہ
انجمنوں کی کثرت میں ہے اور نہ محض مدرسوں اور کالجوں کے قائم
کرنے میں، بلکہ جب تک حضرات انبیاء کرام کے اسوۂ حسنہ اور
داعی اسلام کی سنت مقدسہ سے کوئی دعوتِ حق ماخوذ نہ ہوگی اور
انسانی طریقوں کی جگہ الٰہی سرچشموں سے فیض یاب ہو کر نشو و نما نہ
پائے گی، اس وقت تک وہ کامیابی اور فلاح حاصل نہیں ہو سکتی
جس کے متعلق کلامِ الٰہی نے فرما دیا ہے کہ صرف متقین اور مومنین
ہی کے لئے مخصوص ہے۔"

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ الہلال کی ابتدا سے لے کر ان کی
نظر بندی تک مولانا نے بنیادی طور پر ہمیشہ خدا کا نام لیا اور قرآن
کی دعوت دی اور جب کبھی کوئی بات کہی تو اس کو وحی الٰہی کی دائمی اور
غیر متغیر تعینات اور حقائق کی بنا پر پیش کیا، انھوں نے ہمیشہ
اپنے سامنے ایک یقین رکھا اور اپنی دعوت کی بنیاد انسانی افکار کے بجائے
دینی اعتقادات پر رکھی، انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کا کبھی ذکر کیا، سیاسی
اصولوں اور تقلیدوں کی کبھی دعوت دی، انسانوں کے بنائے ہوئے طریقوں

اور حکمت عملیوں کی طرف بھی اشارے کئے، مگر ان سب کی طرف ان کا زاویۂ نظر ہمیشہ قرآن اور اس کی تعلیمات سے مربوط رہا اور جو چیز ان کے نزدیک اس کسوٹی پر پوری اُتری اس کی تبلیغ و اشاعت میں انھوں نے ایک ایسے سرگرم جوش اور ولولہ کا مظاہرہ کیا جس کی مثال کم ملتی ہے، حسرت موہانی کا یہ قطعہ جو ۲۶ نومبر ۱۹۱۵ء کے البلاغ میں شائع ہوا، حُسنِ ظن سے زیادہ اظہار حقیقت پر مبنی ہے[1]۔

ارباب وفا پرست و حق کوش | تھا جن سے دیار صدق آباد
سب ہو گئے چپ بس ایک حسرت | گویا ہے "ابوالکلام آزاد"

(۷)

الہلال کا ادارۂ تحریر

ابتدائی دور کے الہلال کے اسٹاف میں جو لوگ کام کر رہے تھے ان میں سر فہرست نام مولانا سید سلیمان ندوی کا ہے۔ وہ مئی ۱۹۱۳ء میں کلکتہ گئے اور الہلال سے متعلق ہو گئے، سید صاحب جس زمانہ میں ندوہ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے، اسی زمانے سے مولانا کے ساتھ ان کے روابط قائم ہو چکے تھے اکتوبر ۱۹۱۲ء میں جب وہ مولانا شبلی کے ساتھ پالن جی ہوٹل بائی کلہ بمبئی میں مقیم تھے تو یکم اکتوبر کے ایک مکتوب میں انھوں نے عبدالماجد دریا آبادی کو لکھا:۔

---

[1] البلاغ، ۱۷، ۲۴، ۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء۔ صفحہ ۱

"چند روز ہوئے آزاد صاحب نے الہلال کے لئے مضمون مانگا کیونکہ وہ آج کل سخت مصائب خانگی میں مبتلا ہیں، اس لئے وہ خود کم لکھ سکتے ہیں، میں نے مجموعہ مضامین الندوہ مولانا (شبلی) کے سپرد کردیا لیکن ان کا قرعہ انتخاب آپ ہی کے مضمون پر پڑا اور وہ کلکتہ روانہ ہوگیا۔"[1]

مئی ۱۹۱۳ء میں وہ کلکتہ گئے اور باقاعدہ الہلال کے اسٹاف میں کام کرنے لگے، مگر چند ہی ماہ بعد ان کی طبیعت مولانا ابوالکلام سے اُچاٹ ہوگئی اور انھوں نے کلکتہ سے ۲۶ر اکتوبر ۱۹۱۳ء کو اپنے ایک خط میں عبدالماجد صاحب کو لکھا:۔

"بہت سے پھول صرف دیکھنے کے ہوتے ہیں، سونگھنے کے نہیں، مولوی آزاد وہی پھول ہیں، افسوس ہے کہ میں کبھی دور سے دیکھ کر اس کو سونگھنے کے قابل سمجھا، آپ جانتے ہیں کہ میں علم سیاست اور مذہب کو متحد سمجھتا ہوں اختلافاً کم اسی چیز کا مشتاق ہوکر یہاں آیا تھا، لیکن میری حالت اس شخص کی طرح ہوئی جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے :۔ اعمالهم كسراب بقيعة يحسبه الظمآن ماء ...... میرا بال بال راز ہے اور افسوس ہے کہ اب زیادہ اپنے ضمیر کو مجروح نہیں کرسکتا اس لئے پابہ رکاب ہوں، اور اس ذخیرۂ اسرار مخفی کو اس وقت کے لئے محفوظ رکھتا ہوں جب تک اس کا وقت نہ آئے۔"[2]

سید صاحب کی مولانا کے ساتھ یہ بیزاری کلکتہ میں روز بروز بڑھتی ہی گئی اور وہ تھوڑے ہی عرصہ بعد پونا کالج میں فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر ہوکر

---

[1] مکتوب سلیمانی جلد اوّل ۔ صفحہ ۱۱

[2] مکتوب سلیمانی جلد اوّل ۔ صفحہ ۱۳

چلے گئے"، پونا میں بھی مولانا کی طرف سے سید صاحب کا دل صاف نہ ہوا، مولانا نے ۹ رجنوری ۱۹۱۴ء کو ان کے نام ایک خط میں لکھا:۔

"افسوس کہ میں جس خط کا منتظر تھا وہ باوجود وعدہ آپ نے نہ لکھا اور اس طرح اس اصلاح و مشورہ کی سعی نہ کی جو ایماناً و اخلاقاً آپ پر فرض ہے...... معلوم نہیں اس خط کا نتیجہ کیا نکلے، ڈرتا ہوں کہیں یہ بھی بدگمانیوں کی نذر نہ ہو...... آپ آکر الہلال بالکل لے لیجئے، جس طرح جی چاہے اسے ایڈٹ کیجئے، مجھے اس کے اصول و پالیسی کے (جس میں آپ مجھ سے متفق ہیں) اور کسی بات سے تعلق نہیں...... ایک اور شخص آپ کے اسسٹنٹ ہوں گے اور وہ علماً و سترا ً بکلی آپ کی ایڈیٹری میں روز اوّل سے ہوگا...... سردست آپ تشریف لائیں اور ایک سو تیس روپیہ منظور فرمائیں ...... اس کے بعد ہر ماہ دس کا اضافہ ہوگا، یہاں تک کہ دو سو پورے ہو جائیں[1]۔"

سید صاحب پر مولانا کے اس خط کا جو ردِ عمل ہوا، وہ ان کے ۲۱ جنوری ۱۹۱۴ء کے مکتوب سے ظاہر ہے جو انھوں نے عبدالماجد دریا آبادی کو لکھا، وہ لکھتے ہیں:۔

"سنا آپ کے مولانا ابوالکلام نے مجھ کو ایک رجسٹرڈ خط لکھا کہ ہم ۱۳۰ دیتے ہیں اور دس روپیہ ماہوار کی ترقی تا ۲۰۰، تمام

---

[1] حاشیہ۔ مکتوبات سلیمانی۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۹ و ۱۸ و ۱۷

اشاعت آپ کی زیر نگرانی، نام آپ کا ایڈیٹری میں ظاہر رہے گا، فوراً چلے آئیے۔۔ بتائیے میں نے کیا جواب دیا؟ میں نے لکھا کہ آپ بار بار مجھ سے میری علیحدگی کے اسباب اور رنجش کے اسباب پوچھتے ہیں چنانچہ اس خط میں بھی بہ اصرار پوچھا تھا، میں نے ایک ایک کر کے مختصراً لکھا اور رجسٹرڈ جواب پوچھا لیکن اب تک آواز برنخاست[1]"

سید صاحب کی رنجش کے موجبات کیا تھے اس کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے جو مولانا نے مذکورۂ بالا خط کے جواب میں تحریر کیا تھا" اس خط کا بیشتر حصہ سید صاحب کے کاغذات میں مل گیا، افسوس ہے کہ آخری صفحہ نہ مل سکا، جس پر تاریخ درج ہو گی، یہ خط میرا اندازہ ہے کہ سید صاحب کو شروع فروری ۱۹۱۴ء میں مل گیا ہوگا[2]" اس خط میں مولانا لکھتے ہیں:-

"آپ یقین فرمائیں کہ آپ کے خط کو میں نے تین بار پڑھا، اور اس کے اثر سے بہت دیر تک روتا رہا...... آپ نے کل دس باتیں لکھی ہیں، ان میں کچھ تو میری ذات سے متعلق ہیں، کچھ الہلال کی تحریر و مضامین سے متعلق ہیں، اور کچھ مالی امانت و خیانت کے متعلق ہے، ان میں پہلی قسم بالکل سچ ہے...... دوسری قسم کا تعلق جہاں تک ارادہ اور نیت سے ہے پورے یقین کے ساتھ انکار کرتا ہوں، علم اللہ کہ آغاز کار

---

[1] مکتوبات سلیمانی ۔ جلد اوّل ۔ صفحہ ۲۰ و ۱۹ و ۱۸ و ۱۷

[2] حاشیہ مکتوبات سلیمانی ۔ جلد اوّل ۔ صفحہ ۲۰ عبدالماجد دریا آبادی

سے اس وقت تک کبھی بھی میرا خیال اس شیطنت اور ابلیسی ادعا کا نہیں ہوا واللہ علی ما اقول شہید مگر ممکن ہے کہ میری تحریروں سے ایسا خیال ہوتا ہو، اگر ایسا ہے تو میں ذمہ دار مرتد ہوں اور توبہ کرتا ہوں البتہ تیسری قسم سے الحمدللہ کہ کلی منکر ہوں .... آپ کو معلوم ہے کہ میری حالت ابتدا سے کچھ عجب طرح کی ہے میں نے ایک مذہبی سوسائٹی میں پرورش پائی لیکن ایسے اسباب جمع ہوئے کہ مجھ پر ان کا اثر کچھ نہ پڑا، پھر میں طرح طرح کی بداعمالیوں میں پڑ گیا اور شاید ہی فسق و فجور کا کوئی درجہ ایسا ہو جو مجھ بدبخت سے رہ گیا ہو، عملاً یہ حال تھا اور اعتقاداً ملحد یا مثل ملحد کے تھا، یہ حالت عرصہ تک رہی، لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس عالم میں کبھی کبھی انفعال و انابت کا قوی دورہ ہو جاتا لیکن پھر قائم نہ رہتا، تقریباً پانچ برس ہوئے جبکہ میں بمبئی میں تھا کہ یکایک بعض حالات غم آلود ایسے پیش آئے کہ میری حالت میں انقلاب عظیم ہو گیا، اور خدا تعالے نے توبہ و انابت کی توفیق دی .... یہ تو آپ نے صحیح نہیں لکھا کہ میں صوم و صلوٰۃ کا پابند نہیں، لیکن میرے خیال میں ایک لحاظ سے بالکل صحیح ہے، کیونکہ جو چاہتا ہوں وہ میسر نہیں ہے .... آپ کو معلوم نہیں کہ میں حزب اللہ کے متعلق مضامین لکھ کر پھر کیوں چھوڑ دیتا ہوں .... صرف اس لئے کہ ضرورت کے حس اور طبیعت کے جذبات کی بےخودی میں سلسلہ شروع کرتا تھا اور پھر اپنے تئیں دیکھتا تھا تو اہل نہیں پاتا تھا، حتیٰ کہ گذشتہ ذی الحجہ میں جب اپنی زندگی کی تمام چیزیں بدل دینے

کا قطعی اور آخری فیصلہ کر لیا، اور موانع کو ہٹانا شروع کیا تو پھر آخری بار اس کا اعلان کیا اور اب کام شروع کر دیا ہے، رہی یہ بات کہ آپ لکھتے ہیں کہ تم کیوں لوگوں کو دینی پابندی کی تعلیم کرتے ہو، ......

اس کے جواب میں میں دو باتیں کہوں گا اول تو دینی پابندی سے مقصود بمقابلہ الحاد و ترک اعمال دینیہ، حتی الامکان اعتقاد و عمل بالاسلام ہے، اس کا تعلق جہاں تک ارکان و جوارح سے ہے کرتا ہوں دوسرے حق کا اظہار ہر مسلمان کا ویسا ہی فرض ہے جیسے نماز پڑھنا...... پھر اگر لوگوں سے کہتا ہوں کہ اچھے کام کریں اور حق کو حق سمجھیں تو اپنا ایک فرض ادا کرتا ہوں۔ باقی فرائض میں اگر مجھ سے قصور ہو تو اس کی وجہ سے اس فرض کو کیوں چھوڑوں ...... ہاں حال میں ایک شخص کا خط آیا ہے وہ جناب کے حوالے سے لکھتا ہے کہ تم شراب پیتے ہو، اور اسی وجہ سے مولانا سلیمان چلے گئے، میں نے جی میں کہا کہ یہ تو سچ نہیں ہے معلوم نہیں آپ کی نسبت اس کا بیان سچ ہے یا غلط میں شراب پیتا تھا اور شراب پر کیا موقوف ہے میں نے سبھی طرح کی سیہ کاریاں کی ہیں لیکن الحمدللہ کہ خدا نے مجھے توبہ کی توفیق دی اور اب نہیں کرتا۔

الہلال کے متعلق آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے دعویٰ الہام و امامت و خود پرستی و تشخص و تحقیر ناس و ادعا تبختر و غیرہ و غیرہ میں نہیں سمجھ سکا کہ ایسا کہاں کہاں کیا ہے، اگر دعویٰ الہام سے مقصود وہ مضامین ہیں جن میں ایک مخصوص طرز تحریر سے خدا پرستی

وفادار حق ہونے کی تعلیم تو تعجب ہے کہ آپ ایسا سمجھیں، اگر اس کے معنی ادعاء الہام کے ہیں تو اس طرز کے چند مضامین آپ نے بھی لکھے ہیں، جو از سرتا آخر انجیل کی زبان میں ہیں...... ایک دفعہ آپ نے چندہ کے متعلق لکھی ہے اور اس کی بنا وہی واقعہ ہے جو میں سمجھا تھا، آپ نے لکھا ہے کہ میں نے اپنے سامنے لوٹ پڑتے دیکھا ہے، میں اسی غلط فہمی پر بہت متاسف ہوا نیز معاف کیجیے گا سوء اتفاق یہ ہونا بھی، اصل واقعہ ہے کہ انجمن مسجد کانپور کلکتہ کے جو جلسے ہوتے تھے اس کے ایک جلسہ کا تمام روپیہ جو چار سو کی رقم تھا میرے یہاں آگیا اور مسٹر قطب الدین نے جن کے پاس رہتا تھا صندوق یہاں رکھ دیا، اسی اثنا میں ٹوئن حال کا جلسہ ہوا اور روپیہ کی ضرورت ہوئی اسی میں سے لے کر روپیہ خرچ کیا، پھر ایک معاون منشی عبدالجبار نے تنخواہ کے لئے روپیہ مانگا، روپیہ پاس نہ تھا اور بینک کا وقت گذر گیا تھا نیز دوسرے دن اتوار تھا۔ انھوں نے کہا کہ روپیہ موجود ہے، اس میں سے لے لیں، پرسوں آپ خالی کر دیجیے گا، یہ میں نے ضرورۃً کہا کہ منظور کر لیا اور مسٹر قطب الدین کو بلوا کر کنجی لے کر روپیہ لے لیا، ...... ایک ہفتہ بعد پھر اسی طرح ضرورت ہوئی، تین بج چکے تھے، بینک سے آ نہیں سکتا تھا۔ تحویل خالی تھا، میں نے کہا جس قدر روپیہ باقی ہے سب نکال کر گن لو، اور لے لو، بیشتر کا بھی روپیہ ہے۔ میں مسٹر رسول (خزانچی) کو چیک مجموعی رقم کا بھیج دونگا

اور میں نے چیک ...... مسٹر رسول کو بھیج دیا۔ یہی لوٹ ہے جو جناب نے دیکھی، ...... میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ بھی شانِ امانت کے خلاف ہے مگر میں نے ضرور کیا اور ایک مرتبہ اور کر چکا ہوں، ...... اسی بنا پر آپ نے لکھا ہے اور شک کیا ہے کہ چندوں کا بھی یہی حال ہوگا' بے شک آپ کے اس بیان سے دل بہت زخمی اور غمگین ہوا کہ آپ کے نزدیک میں اب حرام خور اور راخبث ہوگیا...... آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے خود بھی کچھ روپیہ اپنی حالت کے مطابق طرابلس اور بلقان میں دے دیا ہے ...... آخر میں آپ نے ایک اور مبہم بات لکھی ہے یعنی تم مصروف و مشغول آدمی ہو، اپنے مکان کے حالات سے بے خبر رہتے ہو، اس کو بھی میں نہ سمجھ سکا، ...... کھول کر لکھئے۔"[1]

اس خط سے سید صاحب کی رنجش کے تمام موجبات پر واضح طور پر روشنی پڑتی ہے، وہ مولانا کی ذاتی زندگی، ان کے معمولات، الہلال کے لب و لہجہ، اور چندہ کی فراہمی اور اس کے استعمال غرض کہ کسی چیز سے بھی مطمئن نہ تھے، ان تمام وجوہات کے علاوہ کچھ اور بھی خلش ان کے ذہن میں تھی، ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"میں سراپا شکوہ ہوں، کہاں تک اس حجت کو اس ذکر سے ناگوار کروں، مسئلہ وضع اصطلاحات پر جو پہلا مضمون نکلا" ...... مولوی آزاد

---

[1] مکتوبات سلیمانی حاشیہ صفحہ ۲۰ و ۲۱ و ۲۲ و ۲۳ و ۲۴ و ۲۵ و ۲۶

کی غیبت میں نکلا، اس لئے میرے نام سے اور خامۂ اصلاح کے ضربات شدیدہ سے محفوظ رہ کر دوسرا نمبر انھیں مطالب پر مشتمل تھا، ...... لیکن کیا کروں کہ دیگر مضامین کی طرح میرے نام سے معرّیٰ اور ان امور و مطالب ضروری سے معطل شائع ہوا، فہرست علوم کے ساتھ جو عبارت ہے در حقیقت وہ میری نہیں، للّٰہ اس کو میری طرف نسبت نہ دیجئے[10]۔"

چنانچہ وہ مولانا آزاد کے خامۂ اصلاح کی ضربات شدیدہ اور مضامین کو اپنے نام سے معریٰ ہونے کی وجہ سے کبھی بددل تھے اور اسی لئے کلکتہ سے چلے گئے اور ان کی یہ بددلی مولانا کی طرف سے بہت دنوں تک قائم رہی۔ اس سلسلے میں چند اور اقتباسات ملاحظہ ہوں، مولانا نے جب "البصائر" کے نام سے ایک علمی رسالہ نکالنے کا اعلان کیا تو سیّد صاحب نے عبدالماجد دریا آبادی کو لکھا:۔

"البصائر کو آپ کیوں پوچھتے ہیں؟ اس کو کون نکالے وہ الہلال نہیں کہ الفاظ کا طلسم اس کے لئے کافی ہو[11]۔"

پونہ سے لکھتے ہیں:۔

"الہلال کا دیلو منگوا لیا تھا، آیا موصول ہوا، لیکن ایک پرچہ بھی اس کے بعد نہیں ملا[12]۔"

---

[10] مکتوبات سلیمانی حصہ اوّل۔ صفحہ ۱۲
[11] مکتوبات سلیمانی حصہ اوّل۔ صفحہ ۱۵
[12] مکتوبات سلیمانی حصہ اوّل۔ صفحہ ۲۱

۲ر فروری ۱۹۱۳ء کو پھر لکھتے ہیں :۔

"آپ کے مولانا ابوالکلام نے مجھے کالج کی غلامی پر غیرت دلائی تھی اور الہلال میں بہ معاوضہ ۱۳۰ روپیہ بہ ترقی دس روپیہ ماہوار تا ۲۰۰ روپیہ دعوت دی تھی، اور یہ بھی طمع دلائی گئی تھی کہ الہلال بالاعلان نام تمہارا ایڈیٹری میں ہوگا، مجھ کو کچھ سروکار نہیں، میں تمہارا محکوم بن کر رہوں گا وغیرہ......"

میں نے لکھا :۔

"بہ دام و دانہ نہ گیرند مرغ دانا را"[1]

۲۶ر جنوری ۱۹۱۵ء کے ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں کہ :۔

"مولوی آزاد کا خط آیا ہے اپنے کو ہمارا ہم عنان ظاہر کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ دارالمصنفین کی ایک اسکیم تیار کرلی ہے۔ ضرورت ہے کہ دارالمصنفین کو علی گڈھ اور الہلال دونوں سے بچایا جائے۔ علی گڈھ میں جو چیز ہوگی آفتاب احمد خاں و امثالہم کے پنجہ میں ہوگی، الہلال کا کام تخیل سے عمل میں کبھی نہ آئے گا"[2]

شبلی منزل اعظم گڈھ سے ۱۷ر نومبر ۱۹۱۵ء کو تحریر فرماتے ہیں :۔

"البلاغ دیکھا ہوگا، اب تو پہلے سے کچھی رنگ۔ زیادہ شوخ ہوگیا ہے علامہ مرحوم (شبلی) کے بعد مشرقی علوم میں اب وہ کس کا ذکر کرتے ہیں"[3]

---

[1] مکتوبات سلیمانی۔ حصہ اول۔ صفحہ ۲۹-۲۸ [2] مکتوبات سلیمانی۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۰
[3] مکتوبات سلیمانی۔ حصہ اول۔ صفحہ ۴۵

مگر سید صاحب کی یہ کدورت اس وقت دور ہوگئی جب وہ مارچ کے آخری عشرہ میں رانچی گئے اور وہاں مولانا سے ملاقات ہوگئی، واپسی پر انھوں نے یکم اپریل ۱۹۱۶ء کو لکھا۔

"رانچی پہونچا تین برس کے بعد مولانا ابوالکلام کی زیارت ہوئی۔ بڑے تپاک سے ملے، بڑی مسرت ظاہر کی، خوب خوب صحبتیں رہیں، وہ بھی تطبیق معقول و منقول کے دیرینہ ذائقہ سے گھبرا گئے ہیں، آج کل ابن تیمیہ اور ابن قیم کا رنگ غالب ہے فقہ و عقاید میں ہر چیز میں ٹھیک ظاہریت مسلک ہے رانچی کی شور و سنگستانی زمین ان کے سحر زبان اور جادوے بیان سے پانی ہوگئی ہے، وہ بھی میٹھا، مدرسہ کی عمارت چھوٹی لیکن خوبصورت اور شاندار بنی ہے، لوگ بہت مانتے ہیں[۱]۔"

یہ پتہ لگانا کہ اپنے دورانِ قیام میں سید صاحب نے کون کون سے مضامین الہلال میں لکھے، دشوار امر ہے، اس لئے کہ ان تمام صاحبانِ قلم کے مضامین جو الہلال کے اسٹاف میں بحیثیت ملازم کام کر رہے تھے عموماً ان کے ناموں سے معریٰ شائع ہوتے تھے، ۲۷ راگست ۱۹۱۳ء کے الہلال میں مذاکرہ علمیہ کے زیر عنوان 'عربی زبان' اور علمی اصطلاحات پر جو مضمون شایع ہوا ہے اس پر مولانا السید سلیمان الندوی کا نام درج ہے اور وہ بھی اس لئے کہ اس وقت مولانا آزاد کلکتہ میں تشریف نہیں رکھتے تھے، اور مسوری گئے ہوئے تھے، سید صاحب کے مکاتیب سے اس بات کا پتہ بھی چلتا ہے کہ الہلال میں جب تک وہ رہے، افکار و حوادث کے زیر عنوان جو کچھ بھی شایع ہوا

---

[۱] مکتوبات سلیمانی حصہ اوّل صفحہ ۱۱۶ - ۱۱۵

انھیں کے قلم سے نکلا ہے، ۲ ر فروری ۱۹۱۴ء کو پونہ سے معارف کے سلسلے میں حبیب الرحمٰن شیروانی دریا آبادی کو لکھتے ہیں :-

"شذرات یا اخبار و افکار یا اشتات کی سرخی سے ہر مہینہ کے عام حوادث و واقعات پر خیالات متفرقہ مختصر و بلیغ الفاظ میں ضرور ہوں جس طرح الندوہ میں شذرات یا الہلال میں افکار و حوادث کے نام سے لکھا کرتا تھا، لوگ ان کو نہایت دلچسپی سے پڑھتے ہیں[۱]"

افکار و حوادث کے علاوہ سید صاحب نے کچھ اور مضامین الہلال میں لکھے جن میں بعض آج تک مولانا ابوالکلام سے منسوب ہیں، رسالہ "مستقبل" کراچی بابتہ ماہِ اکتوبر ۱۹۴۹ء میں سید صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"الہلال میں چونکہ مضمون نگاروں کے نام نہیں لکھے جاتے تھے اس لئے الہلال کے مضمونوں کے مجموعوں کو شائع کرنے والوں نے بلا تحقیق ہر مضمون کو مولانا ابوالکلام صاحب کی طرف منسوب کر دیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، الحریۃ فی الاسلام، تذکار نزول قرآن، حبشہ کی تاریخ کا ایک ورق، قصص بنی اسرائیل، مشہد اکبر وغیرہ میرے مضامین ہیں[۲]"

چنانچہ ان مختلف بیانات سے سید صاحب کے مضامین کی حسب ذیل تفصیل ملتی ہے۔

۱۔ الحریۃ فی الاسلام قسط اول   شمارہ ۲۔ جولائی ۱۹۱۲ء

---

[۱] مکتوبات سلیمانی حصہ اول صفحہ ۱۸   [۲] معارف سلیمان نمبر مئی ۱۹۵۵ء صفحہ ۸-۹

نمبر	مضمون	قسط	شمارہ	تاریخ
۲۔	الحریۃ فی الاسلام	قسط دوم	شمارہ	۹ر جولائی ۱۹۱۳ء
۳۔	" "	" سوم	"	۱۶ر جولائی ۱۹۱۳ء
۴۔	" "	" چہارم	"	۲۴ر ستمبر ۱۹۱۳ء
۵	" "	" پنجم	"	یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء
۶۔	" "	" قسط ششم	"	۸ر اکتوبر ۱۹۱۳ء
۷۔	تذکار نزول قرآن		"	۶ر اگست ۱۹۱۳ء
۸۔	مشہد اکبر	قسط اوّل	"	۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء
۹۔	مشہد اکبر	" دوم	"	۳ر ستمبر ۱۹۱۳ء
۱۰۔	تاریخ اسلام کا ایک غیر معروف صفحہ ملک حبش میں ایک اسلامی حکومت	قسط اوّل	شمارہ	۱۰ر ستمبر ۱۹۱۳ء
۱۱۔	" " "	قسط دوم	شمارہ	۱۷ر ستمبر ۱۹۱۳ء
۱۲۔	" " "	" سوم	"	۲۴ر ستمبر ۱۹۱۳ء
۱۳۔	" "	" چہارم	"	یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء
۱۴۔	قصص بنی اسرائیل	" اوّل	"	۲۴ر ستمبر ۱۹۱۳ء
۱۵۔	" "	" دوم	"	۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۳ء
۱۶	" "	" سوم	"	۱۲، ۱۹ر نومبر ۱۹۱۳ء
۱۷۔	عربی زبان اور علمی اصطلاحات	" اوّل	"	۲۷ر اگست ۱۹۱۳ء

نمبر	عنوان	قسط	شمارہ	تاریخ
۱۸۔	عربی زبان اور علمی اصطلاحات	قسط دوم	شمارہ	۳ ستمبر ۱۹۱۳ء
۱۹۔	افکار و حوادث		"	۱۰ ستمبر ۱۹۱۳ء
۲۰۔	" "		"	۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء
۲۱۔	" "		"	۱۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء
۲۲۔	" "		"	۲۲ اکتوبر ۱۹۱۳ء
۲۳	" "		"	۲۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء
۲۴۔	" "		"	۵ نومبر ۱۹۱۳ء
۲۵۔	آثار اسلامیہ عمارت بیجاپور	قسط اول	البلاغ	۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء
۲۶۔	" " "	" دوم	"	۲۶ نومبر ۱۹۱۵ء
۲۷۔	اسلام اور سوشلزم		"	۱۱ فروری ۱۹۱۶ء
۲۸۔	اصلاح معاشرت در اسلام		"	۱۸ فروری ۱۹۱۶ء
۲۹۔	" " "	قسط دوم	"	۲۵ فروری ۱۹۱۶ء
۳۰۔	مدارس اسلامیہ		"	۳، ۱۰ مارچ ۱۹۱۶ء

سید سلیمان ندوی کے علاوہ الہلال کے اسٹاف میں کچھ دنوں تک مولانا عبدالسلام ندوی بھی شامل رہے، الہلال میں جانے کے علاوہ ندوہ میں اپنی علمی اور ادبی زندگی کا آغاز کر چکے تھے، اور الندوہ کے سب ایڈیٹر اور پھر ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے شاہ معین الدین لکھتے ہیں:۔

"جب مولانا شبلی نے سیرۃ النبی کی تالیف کا کام شروع کیا تو مولانا

عبدالسلام کو اپنا لٹریری اسسٹنٹ بنایا۔ اسی زمانے میں مولانا
ابوالکلام بھی مولانا شبلی کے زیر تربیت تھے، وہ بھی الندوہ کے
ایڈیٹر رہ چکے تھے اور مولانا عبدالسلام کا ساتھ رہ چکا تھا، چنانچہ
۱۹۱۲ء میں جب انھوں نے کلکتہ سے اپنا مشہور اخبار الہلال نکالا
تو مولانا عبدالسلام کو بھی بلالیا۔ اور وہ ڈیڑھ دو سال تک الہلال
میں کام کرتے رہے[1]"

نومبر ۱۹۱۴ء میں جب الہلال بند ہوا تو وہ بھی وہاں سے نکل کر اعظم گڈھ شبلی منزل چلے آئے اور پھر زندگی کے سارے دن وہیں علمی اور تصنیفی کاموں میں گزار کر ۱۹۵۶ء میں انتقال فرمایا اور شبلی منزل کے احاطہ ہی میں مدفون ہوئے۔

مولانا عبدالسلام نے کون سے مضامین الہلال میں لکھے اس کا تعین کرنا مشکل ہے ان کا صرف ایک مضمون "ھذا فراق بيني وبينك" جو ۶ر اگست ۱۹۱۳ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے اس پر ان کا نام درج ہے، اس کے علاوہ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں صفحہ ۱۲ پر "علامہ شبلی کی قدر دانی" کے عنوان سے سولہ سطروں کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے جو ان کے نام سے ہے اور جس میں حضور نظام کی علم پروری کا ذکر ہے اور مولانا شبلی کے وظیفہ میں دو سو روپیہ ماہوار کے اضافہ کا چرچا ہے البلاغ میں ان کے نام سے ایک مضمون "تربیت یافتگان عہد نبوت" ۳ر اور ۱۰ر مارچ ۱۹۱۶ء کے مشترکہ شمارے میں شائع ہوا ہے اس کے علاوہ انھوں نے الہلال کے لئے جو کچھ بھی لکھا وہ حسب معمول ان کے نام سے معری شائع ہوا، ۵ر اکتوبر ۱۹۱۲ء

---

[1] شاہ معین الدین۔ شبلی نیشنل کالج میگزین ۵۹۔۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۲

کے ایک مکتوب میں مولانا شبلی ان کو لکھتے ہیں :۔

"تمہارے مضامین دیکھتا ہوں، مولوی ابوالکلام صاحب اجازت دیں تو نام لکھا کرو، ایسے مضامین گم نام ٹھیک نہیں، اس سے کیا فائدہ کہ ایک شخص کی زندگی گم ہوجائے، تمہاری قوت اور نمود سے بہرحال ہماری سوسائٹی کو فائدہ ہی ہوگا۔"[1]

اُنھوں نے پہلے بھی ایک خط میں تاکید کی تھی :۔

"تم الہلال میں جاؤ مضائقہ نہیں لیکن یہ شرط کر لو کہ تم الہلال میں جذب نہ ہوجاؤ، یعنی جو لکھو اپنے نام سے لکھو، ورنہ تمہاری زندگی پر بالکل پردہ پڑجائے گا، اور آیندہ ترقیوں کے لئے مضر ہوگا۔"[2]

سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام کے علاوہ حامد علی صدیقی، عبدالواحد کانپوری اور مولانا عبداللہ عمادی جو اس عہد کے مشہور لکھنے والوں اور مشاہیر علم میں گنے جاتے تھے، الہلال کے اسٹاف میں شامل تھے، مولانا عمادی، علامہ شبلی کے خصوصی ہم نشیں اور ہم رنگ تھے، وہ الندوہ، وکیل، اور زمیندار میں لکھتے رہے اور بعد عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ تالیف و ترجمہ میں کام کرتے رہے، مولانا عبدالماجد دریا آبادی اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :۔

"یہ لوگ تو باقاعدہ اسٹاف میں تھے، باہر کے ایک صاحب بھی

---

[1] مکاتیب شبلی۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۷۹ [2] مکاتیب شبلی جلد ۲ صفحہ ۱۷۵

انگریزی معلومات کی حد تک مدد دیتے رہتے تھے' یہ مرزا محمد عسکری بی' اے لکھنوی تھے جو اس وقت گورنمنٹ آف انڈیا میں مترجم تھے اور پھر تاریخ ادب اردو وغیرہ کے مصنف و مترجم رہے۔[1]"

۱۹۲۷ء میں جب الہلال پھر سے جاری ہوا تو جو لوگ اس کے اسٹاف میں تھے اس میں سرفہرست نام عبدالرزاق ملیح آبادی کا تھا' وہ لکھتے ہیں:۔

"آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ اتنے بڑے اخبار کا اسٹاف اکیلا ملیح آبادی تھا' اس دوسرے دور میں مولانا نے الہلال میں ایک ہی اچھا مضمون لکھا' یہ مضمون وکٹر ہیوگو کے ناول لامزیبل کے ہیرو جان ولجان کے پادری کو حضرت جنیدؒ بغدادی کی صورت میں پیش کرنے والا تھا...... مولانا کا مضمون اس ناول سے کم درجے کا نہیں' اس کے علاوہ مولانا نے نیشنلزم پر دو تین مضمون لکھے۔[2]"

اس دور میں بھی مضامین مصنفین کے نام سے معرّیٰ چھپتے تھے' چنانچہ الہلال میں ملیح آبادی کا نام کبھی نہیں چھپتا تھا' نتیجہ یہ نکلا کہ "عالمِ انسانیت موت کے دروازے پر" کے عنوان سے جتنے مضامین نکلے انھیں لوگوں نے مولانا کی تصنیف قرار دے کر کتابی صورت میں شایع کر دیا۔[3]" حالانکہ یہ سلسلہ ملیح آبادی کا لکھا ہوا تھا۔

۱۹۲۷ء اس دور میں واقعتاً مولانا کے لکھے ہوئے مضامین کم شائع ہوئے' ۹ر دسمبر

---

[1] مکاتیب شبلی۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۷۵ [2] ذکر آزاد۔ صفحہ ۳۳۴

[3] ذکر آزاد۔ صفحہ ۳۳۴

کے شمارے میں ان کا اعلان شائع ہوا ہے اور انھوں نے اس بات کی معذرت چاہی ہے کہ ان کے خاص مضامین کی قلت رہی ہے[1]"

(۸)

الہلال کی دعوت ۸ار نومبر ۱۹۲۱ء کو جمعیۃ العلماء ہند کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا تھا:۔

"یہی وہ یوسف مقصود ہے جس کے فراق میں ۱۹۱۱ء سے مسلسل واسفاً علی یوسف کی نغاں سنجی کر رہا ہوں اور جس کے لئے میں نے الہلال مرحوم کے صفحوں کو کبھی اپنے چشمِ خونیں کے آنسوؤں سے رنگا ہے اور کبھی اس کے سوادِ حروف کے اندر اپنے دل و جگر کے ٹکڑے بچھا دیے ہیں، خدا کی کوئی صبح مجھ پر ایسی طلوع نہیں ہوئی جب اس مقصد کی طلب سے میرا دل خالی ہوا ہو اور کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گذری جب میں نے اس تمنا میں اپنے بسترِ غم و اندوہ پر بے قراری کی کروٹیں نہ بدلی ہوں[2]"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا "یوسفِ مقصود" تھا جس کے لئے مولانا نے الہلال کے سوادِ حروف کے اندر اپنے دل و جگر کے ٹکڑے بچھا دیے تھے، اور جس کے لئے انھوں نے اپنے بسترِ غم و اندوہ پر بے قراری کے ساتھ کروٹیں بدلی

---

[1] الہلال ۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء [2] الجمعیۃ آزاد نمبر۔ صفحہ ۱۳۲

تھیں لیکن قبل اس کے کہ ہم اس یوسفِ مقصود کا پتہ لگائیں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ الہلال کے اجرا کے وقت ہندوستانی مسلمانوں کی ان سیاسی اور مذہبی روایات کا ایک سرسری جائزہ لے لیں جو الہلال کے اجرا کا پس منظر بنیں، ہندوستان میں انگریزی حکومت کے استحکام کے ساتھ ساتھ مغربی علوم وفنون اور اس کی نظر فریب تہذیب، مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی روایات کو رفتہ رفتہ مسمار کرتی چلی جا رہی تھی اور سیاسی غلامی کی لعنت سے زیادہ بدترین ذہنی غلامی کی لعنت ان کے اندر اپنے جال بچھا رہی تھی، ان کو خیال ہو گیا تھا کہ مذہب اسلام محض مابعد الطبیعاتی عقاید کا ایک مجموعہ ہے جو بدلے ہوئے معاشرتی، تمدنی اور عمرانی حالات میں ان کی زندگی سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا[۱]" سرسید کے نزدیک اس مرض کا واحد علاج یہی تھا کہ مسلمانوں کو جدید تعلیم اور زمانے کے نئے تقاضوں سے آشنا کیا جائے اور انھیں حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے آمادہ کیا جائے، غازی پور کی سائنٹفک سوسائٹی کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے اپنی تقریر میں نہ صرف جدید علوم کے فائدے گنوائے تھے بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ "تاریخ ہم کو اس لئے پڑھنی چاہیئے کہ بغاوت کی غلطی کا ہم دوبارہ اعادہ نہ کر سکیں[۲]"

---

[۱] صباح الدین عبدالرحمٰن معارف نومبر ۱۹۵۸ء ۔ صفحہ ۳۲۵

[۲] GRAHAM—LIFE AND WORK OF SIR SYED AHMAD KHAN—PAGE 52-54

انگلستان کے سفر نے ان کے عقائد کو اور بھی زیادہ راسخ کر دیا تھا، وہاں انھوں نے "یورپین تمدن کو پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر دیکھا اور وہ اس درجہ متاثر ہوئے کہ بچوں کی طرح ان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں، پہلے تو صرف سیاسی اعتبار سے وہ انگریزوں سے وابستگی پیدا کرنے کے پُر زور مبلغ تھے اب تمدنی اعتبار سے بھی انگریزوں سے گہری دلچسپی ہوگئی اور انھوں نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ اپنے ہم مذہبوں کو اس پر آمادہ کریں کہ انگریزی راج ہی کو نہیں بلکہ مغربی تمدن کو بھی قبول کرلیں[1]"۔ انگلستان کے دوران قیام میں سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں ان کی غیر معمولی آؤبھگت ہوئی، وہ خود ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"حضور ملکہ معظمہ نے مجھ کو کمپینین آف دی اسٹار آف انڈیا سے معزز و ممتاز فرمایا اور تمغۂ اسٹار آف انڈیا مرحمت ہوگا اب میں احباب کی دعا سے خان بہادر، سی۔ آئی۔ ای ہوگیا، اس موقع پر تمام معزز انگریز دوستوں نے مبارکبادی اس درجہ کی دی ہے اور ایسا معزز خیال کیا ہے کہ یہاں سے باہر لارڈ لارنس نے گورنر جنرل بہادر نے میرے لئے جلسہ مقرر کیا اور بڑے بڑے رؤسا اور مدبروں کو بلایا[2]"

انگلستان سے واپسی کے بعد ٹیٹلر اور اسپکٹیٹر کی نقل پر انھوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا جس نے مسلمانوں کے سماجی، مذہبی اور علمی حلقوں

---

[1] DISCOVERY OF INDIA PAGE 298

[2] خطوط سرسید، راس مسعود ـ صفحہ ۲۶

میں ہلچل مچادی اور اس نے ہندوستانی مسلمانوں کو رجعت پرستی کے گہرے غار سے نکال کر روشن خیالی کی وسیع فضا میں پہونچا دیا، قدامت پرست مذہبی طبقہ کے اختلاف کے باوجود سرسید اپنے مشن میں سرگرم رہے اور "۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو جو ملکہ معظمہ کی سالگرہ کا دن تھا مدرستہ العلم کی بنیاد رکھدی گئی، یہی اسکول بعد میں کالج اور پھر یونیورسٹی بنا اور تمام دنیا میں مشہور ہوا[1]" عام مسلمان تو سرسید کی مذہبی تحریک کے مخالف تھے ہی اس لئے وہ چندہ میں شریک نہ ہوئے لیکن حکام وقت نے دل کھول کر چندے دیئے، سب سے پہلے سر ولیم میور نے جو صوبۂ متحدہ کے لفٹیننٹ گورنر تھے خود ایک ہزار روپیہ اپنی جیب سے دیا اور ان کی ایما سے والئ رام پور اور دیگر رؤسا نے چندہ میں شرکت کی" لارڈ نارتھ بروک وائسرائے ہند نے ۱۸۷۲ء میں یعنی کالج قائم ہونے سے تین سال قبل اپنی جیب خاص سے دس ہزار روپیئے دیئے تھے[2]" سرسید کے خلوص اور نیک نیتی سے انکار کرنا مشکل ہے لیکن یہ نوزائیدہ درس گاہ "سرسید کے خواب سے زیادہ میکالے کے اس خواب کی تعبیر تھی...... جو اس نے نصف صدی قبل ۱۸۳۲ء میں دیکھا تھا، اور وہ خواب یہ تھا کہ ہندوستانیوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو جو رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو لیکن فکر و مذاق اور دل و دماغ کے اعتبار سے انگریز ہو، سرسید بھی مسلمانوں کا ایک ایسا فرقہ پیدا کرنا چاہتے تھے، جو قومی اعتبار سے ہندوستانی مذہبی اعتبار سے مسلمان اور

---

[1] مولوی طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل

[2] مولوی طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل ۔ صفحہ ۲۱۶

فہم و ادراک اور مذاق و رائے کے اعتبار سے انگریز ہو، چنانچہ کالج کا نہ صرف نصاب تعلیم مغربی تھا، بلکہ ذریعۂ تعلیم پرنسپل اور اساتذہ بھی انگریز ہی تھے، فرق صرف اس قدر تھا کہ عیسائی دینیات کی جگہ اسلامی دینیات نے لے لی تھی۔ سرسید برطانیہ پرست ضرور تھے مگر اسی کے ساتھ ان کی زندگی کا ایک بڑا روشن اور تابناک پہلو یہ تھا کہ وہ ایک پکے ہندوستانی بھی تھے، ۱۸۸۳ء میں مسٹر بک اپنے مخصوص سیاسی نظریات کے ساتھ کالج کے پرنسپل بن کر آئے، وہ نہ صرف عام انگریزوں سے مختلف بلکہ بقول ڈبلو، سی، بلنٹ "بہت عیار" بھی تھے[1] ان کی آمد ہندوستان میں اس وقت ہوئی جبکہ ہندوستان کے تعلیمی حلقوں میں سیاسی بےچینی بہت بڑھ گئی تھی اور بنگال میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے مسٹر سریندر ناتھ بنرجی انڈین سول سروس کے امتحانات کے سلسلے میں یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ وہ ہندوستان میں ہوا کریں اور عمر کی میعاد بڑھا دی جائے، سرسید اس تجویز کے حق میں تھے، ان کی دعوت پر سریندر ناتھ بنرجی علی گڑھ آئے اور انھوں نے اپنی تقریر میں سیاسی اور نیم سیاسی امور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا " ہم لوگ ٹیکس ادا کرتے ہیں، یہ لوگ (مسٹر بک کی طرف اشارہ کرکے) جس طرح ان کا جی چاہتا ہے ان محصولات کو خرچ کرتے ہیں اور حظ اٹھاتے ہیں[2] "۔ بابو سریندر ناتھ بنرجی کی تقریر سننے کے بعد مسٹر بک پولیٹکل دنگل میں اترنا

---

[1] W.C. BUNT — INDIA UNDER REPORT

[2] مولوی طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل ۔ صفحہ ۲۷۸

چاہتے تھے اور بنگالیوں کے بڑھتے ہوئے اثر کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے،...... انھوں نے سرسید سے کہا کہ آپ کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی طرف توجہ کرنے کی فرصت نہیں ہے، آپ اس کو میرے سپرد کر دیجئے، میں اس کی حالت درست کر دوں گا، سرسید نے اسے بخوشی منظور کر لیا اور مسٹر بک ...... نے بنگالیوں اور ان کی تحریک کے خلاف انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ایڈیٹوریل کالم میں مضامین لکھنا شروع کئے اور اس طرح بنگالیوں سے علانیہ لڑائی شروع ہوگئی[1]" بہرحال انسٹی ٹیوٹ ہال میں سریندر ناتھ بنرجی کی تقریر کے بعد "سرسید کی تعلیمی تحریک نے جارحانہ سیاسی رنگ اختیار کرلیا، سرسید کے ہاتھوں سے علی گڑھ کی قیادت نکل جانے کے بعد، یہ سرسید تحریک نہیں رہی بلکہ علی گڑھ تحریک بن گئی اور طوطی صفت سرسید حقیقی معنوں میں پس آئینہ بیٹھ گئے[2]" اور اب بقول مولوی طفیل احمد "قوم خدا کی، کالج سرسید کا اور حکم بک بہادر" کا چلنے لگا۔ ۱۸۸۵ء میں کانگریس قائم ہوئی اور اس باب میں بھی علی گڑھ کا رویہ زیادہ پختہ ہوگیا اور بک کی قیادت اور پالیسی ان کے جانشینوں پر منتقل ہوتی رہی، اور جب ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن نے ہندوؤں کو کمزور بنانے، ان کے اور مسلمانوں کے درمیان خلیج قائم کرنے کے لئے بنگال کو تقسیم کر دیا تو بنگال نے اس حکم کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا بلکہ ایک ایسا سیاسی اور انقلابی جوش پیدا اور کارفرما ہوا جس کی مثال کسی سابق عہد میں نہیں ملتی، شری آربندو گھوش بڑودہ سے کلکتہ آگئے تاکہ اس شہر کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنائیں

---

[1] مولوی طفیل احمد، مسلمانوں کا روشن مستقبل۔ صفحہ ۲۷۸

[2] محمد عتیق صدیقی۔ شاہراہ آزاد نمبر۔ صفحہ ۷۹

اور ان کا اخبار "کرم یوگن" بقول مولانا آزاد، قومی بیداری اور غیروں کی حکومت کے خلاف جنگ کا جھنڈا بن کر لہرانے لگا۔[1] اسی زمانے میں مولانا آزاد کا تعارف شیام سندر چکرورتی سے ہوا اور انھیں کے توسط سے وہ دوسرے انقلابی رہنماؤں سے ملے اور انقلابی سیاست میں حصہ لینے کی خواہش ان کے دل میں بیدار ہوئی اس وقت من حیث الجماعت مسلمان کانگریس سے الگ مسلم لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع تھے انھوں نے عموماً اور بنگال کے مسلمانوں نے خصوصاً اس تقسیم کو خوش آمدید کہا چنانچہ اس وقت بقول مولانا آزاد "تمام انقلابی جماعتیں مسلمانوں کی مخالفت میں سرگرم تھیں، وہ دیکھتی تھیں کہ برطانوی حکومت نے ہندوستانی تحریک آزادی کے مخالفت میں مسلمانوں کو آلہ کار بنا رکھا ہے اور مسلمان اس کے اشارے پر چلتے ہیں۔[2]"

انگریزوں کو بھی مسلمانوں پر اعتماد تھا، اور بیم فیلڈ فلر جو اس وقت بنگال کا گورنر تھا، اعلانیہ کہتا تھا کہ حکومت مسلمانوں کی جماعت کو اس نظر سے دیکھتی ہے جیسے کوئی شوہر حرم کی محبوب بیوی کو، چنانچہ انقلابیوں کے خلاف کارروائیاں کرنے کے معاملے میں حکومت کا اعتماد بنگال کے ہندوؤں سے اُٹھ گیا تھا اور انھوں نے پولیس کے خفیہ محکمے میں یوپی کے مسلمانوں کو بلا کر رکھ لیا تھا، "جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال کے ہندو یہ محسوس کرنے لگے کہ مسلمان سیاسی آزادی اور ہندوؤں کی جماعت کے مخالف ہیں۔[3]" غلط روی کے اس طوفان میں ہم کو دو مسلمانوں کے نام ملتے

---

[1] ہماری آزادی ۔ صفحہ ۱۴
[2] ہماری آزادی ۔ صفحہ ۱۵
[3] ہماری آزادی ۔ صفحہ ۱۶

ہیں جنھوں نے تقسیم بنگالہ کی مخالفت کی تھی، یہ دونوں مسلمان کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر تھے، ایک کا نام ڈاکٹر اے سہروردی تھا اور دوسرے کا نام عبدالرسول، موخرالذکر اس کانفرنس کے صدر تھے، جو ۱۹۰۶ء میں تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کی تحریک کا افتتاح کرنے کے لئے منعقد ہوئی تھی مگر مجموعی اعتبار سے مسلمانانِ ہند سیاسی جدوجہد سے الگ تھلگ رہنے کو اپنی قومی پالیسی سمجھتے تھے، مسلم لیگ قائم ضرور ہوچکی تھی، "مگر اس کا پالیٹکس بھی صرف یہی تھا کہ ملک کی عام سیاسی ترقی کی روک تھام میں دفتری اقتدار کا ہاتھ بٹائے اور جہاں تک ہو ہر حرکت و ترقی کو روکے، اس نے صاف صاف اعلان کردیا تھا کہ مسلمانوں کا پولٹیکل کام یہ نہیں ہے کہ گورنمنٹ سے حقوق طلب کرے بلکہ صرف یہ ہے کہ ہندوؤں کی پولٹیکل جدوجہد کی مخالفت کرے، مسلمانوں میں سے گنتی کے چند افراد جو انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہوئے تھے، ان کے سامنے بھی خود اپنی کوئی راہ نہ تھی۔"[1]

اسی زمانہ میں مولانا آزاد کو ہندوستان سے باہر جانے اور عراق مصر، شام اور ترکی کے سفر کرنے کا اتفاق ہوا، عراق میں ان کی ملاقات چند عراقی انقلابیوں سے ہوئی، مصر میں مصطفےٰ کمال کے پیروؤں سے ان کے تعلقات پیدا ہوئے، قاہرہ میں ینگ ٹرکس کے مرکز پر وہ گئے اور ترکی میں اس تحریک کے چند لیڈروں سے ان کی دوستی ہوگئی، جن سے کئی سال بعد تک ان کی خط و کتابت جاری رہی، ان تمام تعلقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا کو "اور بھی زیادہ یقین ہوگیا کہ مسلمانوں کو ملک کی آزادی کی مہم میں شرکت و معاونت کرنا

---

[1] مقدمہ۔ تذکرہ۔ صفحہ ۸۔۷

چاہیے' اور اس کی تدبیر کرنا چاہیے کہ برطانوی حکومت اپنی اغراض کے لئے انھیں ناجائز طور پر استعمال نہ کر سکے۔[لہ] اسی کے ساتھ چونکہ مولانا کے مزاج کی تشکیل میں نسل و خاندان کی وہ مٹی بھی کام آئی تھی جس کا ایک ایک ذرہ صدیوں سے علم و ارشاد اور اعمال صالح کی تخلیق میں سازگار ثابت ہوا اور ان کی سب سے بڑی آرزو" اسلاف کرام کے طریق صدق و حق پر مستقیم رہنے کی تھی' اس لئے سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ان کا یہ راسخ عقیدہ تھا کہ اسلام محض ایک ذہنی تصور اور عقاید و عبادات کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی زندگی کے لئے ایک مکمل قانون ہے اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں ہے جس کے لئے وہ حکم نہ ہو' مولانا لکھتے ہیں :-

"اسلام اپنی توحید کی تعلیم میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں' مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی' سیاسی ہو یا معاشرتی' دینی ہو یا دنیاوی حاکمانہ ہو یا محکومانہ' وہ ہر زندگی کے لئے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے...... جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا ہے وہ پھر کسی انسانی دست گیری کا محتاج نہیں[لہ]"

چنانچہ اسی راسخ عقیدے کے تحت الہلال کی دعوت کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:-

"الہلال کی دعوت کا اصل اصول مسلمانوں کو ان کی زندگی کے ہر عمل اور عقیدے میں اتباع کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی طرف بلانا ہے اور ان کی پہلی تشکیل

لہ ہماری آزادی - صفحہ ۲۰　　لہ الہلال - ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء - صفحہ ۵

پالیسی کے لئے بھی وہ اسی اصول کو پیش کرتا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ مسلمانوں میں جس دن اُن کی گم شدہ قرآنی روح پھر بیدار ہو جائیگی اس دن پھر وہ اپنے اندر ہر چیز کامل و اکمل پائیں گے، پس اصل کار اسلامی تعلیم کا احیاء اور ایک صحیح دعوت کی تحریک ہے۔ بدبختی سے مسلمانوں کے پاس آج قرآن کی اصلی تعلیم حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں صدیوں کی تقلید اور استبداد فکری نے سیکڑوں پردے اصل حقیقت پر ڈال دیئے ہیں اور قرآن و سنت کی کوئی شاخ اس فتنۂ تقلید کے مہلک اثر سے محفوظ نہیں..... پس اگر توفیق الٰہی ساتھ دے تو الہلال مسلمانوں کو ایک ایسی دعوت کی طرف بلانا چاہتا ہے جو تعلیم قرآنی کی ایک خالص دعوت ہو اور جو قوم کے آگے اسلام کی حقیقی تعلیم کی راہ کھول دے۔"[1]

الہلال کی اسی دعوت کو مختلف پیرایہ میں تکرار کے ساتھ مولانا نے قوم کے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے بار بار اس بات پر زور دیا ہے کہ جب اتباع دین اور اعتصام بحبل اللہ ہی کی بدولت خود ان کے پاس فروزاں ہیں تو ان کو کسی فقیر کے جھونپڑے سے ٹمٹماتا ہوا دیا چرانے کی کیا ضرورت [illegible]۔ انھوں نے واضح طریقہ پر لکھا "قرآن کریم صرف نماز اور وضو کے فرائض بتلانے [illegible] کے لئے نازل نہیں ہوا بلکہ وہ انسانوں کے لئے ایک کامل اکمل قانون فلاح ہے جس سے انسانی زندگی کی کوئی شے باہر نہیں، پس مسلمانوں کی ہر وہ پالیسی اور ہر وہ عمل جو قرآنی تعلیم پر مبنی نہ ہوگا ان کے لئے کبھی موجب فوز و فلاح نہیں ہو سکتا۔"[2] اور یہی نہیں بلکہ سختی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی

---

[1] ضمیمہ الہلال، ۲۲ ستمبر ۱۹۱۲ء

[2] القسطاس المستقیم - الہلال ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۲ء

لکھا۔ "ہمارا عقیدہ ہے کہ جو مسلمان اپنے کسی عمل اور اعتقاد کے لئے بھی قرآن کے سوا کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا رہنما بنائے وہ مسلم نہیں، بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس لئے مشرک ہے[1]" انھوں نے خالص خطیبانہ، جذباتی اُتار چڑھاؤ اور مرعوب کن لب و لہجہ کے ساتھ مسلمانوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر یہ بتلایا کہ مسلمانوں کا سارا زوال اور انحطاط صرف اسی ایک غفلت کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے قرآن پاک کو چھوڑ دیا۔ وہ اسی وقت تک ترقی کرتے رہے جب تک قرآن حکیم کی اشاعت اور تبلیغ ان کا ذوق و عشق رہا۔ ان کی تاریخ میں جو کچھ بھی ہے صرف اسی کے لئے ہے، انھوں نے اپنا وطن چھوڑا تو اسی کے لئے عزیز و اقرباء سے مہجور ہوئے تو اسی کی خاطر، مال و دولت لٹایا تو اسی کی یاد میں، ان کی تلواریں بے نیام ہوئیں تو اسی کی صولت کے لئے، اور ان کی گردنوں سے خون بہا تو اسی کے عشق میں کیونکہ ان کی قومی زندگی کی صدا یہ تھی۔ میری عبادت، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا، غرضکہ زندگی اور زندگی میں جو کچھ ہے سب اللہ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، مولانا نے الہلال کے صفحات میں مسلمانوں کو قرآن پاک اور اسلام کی طرف مراجعت کی دعوت دی، تاکہ اس فردوس گم شدہ کی بازیافت ہوسکے، جو قرآن سے دور ہوجانے کی بنا پر ان کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ ان کے مضامین الامر بالمعروف، والنہی عن المنکر، القسطاس المستقیم، الجہاد فی الاسلام، عید الاضحیٰ، موعظہ و ذکریٰ، الحج، محرم الحرام اور حقیقۃ الصلوٰۃ وغیرہ کے پڑھنے

---

[1] القسطاس المستقیم۔ الہلال۔ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۱۲ء

کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اسلامی معاشرہ میں انتشار اور پراگندگی محض اس لئے پیدا ہوئی کہ انھوں نے تعلیمی، تمدنی اور سیاسی زندگی میں قرآن حکیم کی رہبری تلاش نہ کی اور دنیا کی سب سے بڑی سعادت سے جس کے ذریعہ کشور انسانیت کی از سر نو تعمیر ہو سکتی ہے محروم ہو گئے اور اسی بنا پر گمراہی کی ظلمت ان کے راستوں میں پھیل گئی۔

زندگی کے دیگر شعبوں کی طرف سیاسی اعمال کی سلامتی کے لئے بھی انھوں نے قرآن مجید ہی کا نسخہ تجویز کیا، الہلال کی پولٹیکل تعلیم کے سلسلہ میں ایک خط کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے لکھا، "الہلال کی اور تمام چیزوں کی طرح پالٹکس میں بھی یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ ہی پر اعتماد کیجئے اور نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس میں شریک ہوئیے صرف اسی پر چلئے جو اسلام کی بتلائی ہوئی صراط المستقیم ہے[1]" ایک دوسری جگہ انھوں نے لکھا:۔

"ہم اسلام کو اس سے بہت بلند سمجھتے ہیں کہ اس کے پیرو اپنی زندگی کے کسی شعبے میں کسی دوسری قوم کی تقلید پر مجبور رہوں، وہ دنیا کو اپنے پیچھے چلانے والے ہیں نہ کہ خود دوسروں کے مقتدی بننے والے ہیں ہماری تعلیم وہی ہے جو اسلام کی ہے اسلام سے بڑھ کر کوئی تعلیم بغاوت وفساد کی دشمن نہیں، ایک شخص اگر مسلمان ہے تو وہ کبھی فتنہ وفساد اور بغاوت کا مجرم نہیں ہو سکتا، اگر ہندو اکسٹریمسٹ ایسا کرتے ہوں تو مسلمانوں کا فرض ہونا چاہئے کہ گورنمنٹ کے لئے نہیں بلکہ خدا کی زمین

---

[1] الہلال، ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء

امن قائم کرنے کے لئے اس کو دور کرنے کی سعی کریں، البتہ اسلام خدا کی بخشی ہوئی انسانی آزادی کو قائم کرنے والا ہر شخصی استبداد و جبر کا مخالف ہے، وہ اپنے پیرووں کو جائز آزادی حاصل کرنے کے لئے حرکت میں دیکھنا چاہتا ہے، وہ ایک جمہوریت اور مساوات کی روح ہے، اور اس حکومت کو خدا کی مرضی کے مطابق نہیں سمجھتا جو پارلیامنٹری اور دستوری نہ ہو، یہ مقصد مسلمانانِ ہند کو ہندوؤں سے نہیں بلکہ قرآن سے سیکھ کر اپنا نصب العین بنانا چاہئے اور جمود کی جگہ حرکت، آہستگی کی جگہ تیزی، بزدلی کی جگہ ہمت اور گورنمنٹ پر اعتماد کے بجائے خدا اور اس کے بخشے ہوئے دین پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔"[1]

مولانا نے جب مسلمانوں کو اپنی سیاست کی اساس بھی مذہب پر رکھنے کی تبلیغ کی تو بہت سے قارئین نے ان کو سیاسی اور مذہبی تعلیم کو خلط ملط نہ کرنے اور دونوں کو علیحدہ رکھنے کا مشورہ دیا، ایک ایسے ہی خط کے جواب میں مولانا نے لکھا:۔

"آپ فرماتے ہیں کہ پولٹیکل مباحث کو مذہبی رنگ سے الگ کر دیجئے لیکن اگر الگ کر دیں تو ہمارے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے...... ہمارے عقیدہ میں تو ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو، وہ ایک کفر صریح ہے ...... مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر شرم انگیز سوال نہیں ہو سکتا کہ وہ دوسروں کی پولٹیکل تعلیموں

---

[1] الہلال، یکم ستمبر ۱۹۱۲ء

کے آگے سر جھکا کر راستہ پیدا کریں، ان کو کسی جماعت میں شریک ہونے
ضرورت نہیں، وہ خود دنیا کو جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی
راہ پر چلانے والے ہیں...... وہ خدا کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو
ساری دنیا ان کے آگے کھڑی ہو جائے گی...... وہ خدا کی جماعت
ہیں اور خدا کی غیرت اس کو کبھی گوارا نہیں کر سکی کہ اس کی چوکھٹ پر
جھکنے والوں کے سر غیروں کے آگے بھی جھکیں[۵۱]۔"

بقول صباح الدین عبدالرحمٰن "الہلال کا یہ بڑا احسان ہے کہ جب مسلمان انگریزوں اور
ان کے تمدن کی برتری اور فوقیت سے مرعوب ہو کر احساس کمتری میں مبتلا ہو رہے
تھے، تو اس وقت مولانا نے ان کو ان کی "امتیاز ملی" اور "شرف خصوصی" کی
طرف توجہ دلاکر ان میں احساس برتری پیدا کیا[۵۲]۔" یہی نہیں بلکہ انھوں نے برطانوی
حکومت کو بھی آگاہ کیا کہ "اگر ہم سچے مسلمان ہو جائیں تو جس قدر اپنے نفس کے
لئے مفید ہوں اتنا ہی گورنمنٹ کے لئے نیز اسی قدر اپنے ہمسایوں کے لئے......
پس گورنمنٹ کی مصلحت بھی یہی ہے کہ ہم کو مسلمان بننے کے لئے چھوڑ دے کیونکہ مسلمان
ہونے کے بعد ہم اپنے نفس کے لئے اور نیز تمام عالم کے لئے یکساں طور پر مفید ہو سکتے ہیں[۵۳]۔"

۵۱۔ الہلال، ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء

۵۲۔ معارف، نومبر ۱۹۵۸ء ۔ صفحہ ۳۲۱

۵۳۔ الہلال، ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء

۹

مشرق وسطیٰ کے مسائل ہندوستان کے مسلمانوں کے علاوہ مولانا کے قلم نے ان مسائل کی جانب بھی توجہ دی جو مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کے سامنے درپیش تھے، انھوں نے دنیا کے تمام گوشوں میں بسنے والے پیروانِ اسلام کو اُخوت دینی، مؤدت ملی اور اتحادِ اسلامی کا پیغام دیا، الہلال کے صفحات کا ایک بڑا حصہ حقانیت سے بھرا ہوا ہے، انھوں نے اپنی کمسنی میں شیخ جمال الدین کا آخری زمانہ پایا تھا، مشرق کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرنے اور اسلام کے منتشر شیرازے کو وحدت کا سبق دینے والے اس مردِ عظیم کی اہمیت ابتدا ہی سے مولانا آزاد کے دل و دماغ میں جاگزیں ہوگئی تھی۔ انھوں نے الہلال کے صفحات میں شیخ کو ہندوستان سے روشناس کرایا تھا، شام، فلسطین، عراق اور مصر کے سفر میں شیخ جمال الدین اور ان کے دست راست شیخ محمد عبدہٗ اور رشید رضا کی تعلیمات سے بھی وہ متاثر ہوئے تھے سفر سے واپسی کے بعد مولانا آزاد اپنی رہنمائی کے لئے مشعل اسی آگ سے جلالائے جو شیخ نے ان ممالک میں روشن کر رکھی تھی خود کلکتہ کے اندر شیخ کا ایک منظم گروہ سرگرم عمل تھا، اور شیخ کے مقالوں کا اوّلین مجموعہ "مقالات جمالیہ" بھی شیخ موصوف کی اجازت سے ۱۸۸۴ء میں ریپن پریس کلکتہ ہی سے شائع ہوا تھا۔[1]"

الہلال کے اجراء کے وقت عالمِ اسلام کی نئی زندگی میں غیر معمولی جوش و خروش

---

[1] مولانا سلیم احمد۔ الجمعیۃ آزاد نمبر۔

پیدا ہو گیا تھا، اٹلی کے طرابلس پر حملہ کرتے ہی ترکی اور مصر کے ارباب علم اور طلبا کی ایک بڑی تعداد نے عثمانی دفتر جنگ سے رابطہ قائم کرنے اور والنٹیروں کی ایک بڑی تعداد میدانِ جنگ میں پہونچ گئی،" شیخ سنوسی اپنی خانقاہ چھوڑ کر اعلانِ جہاد کرتے ہوئے ایک جرار فوج کے ساتھ آگے بڑھے، حجاز سے ایک بڑا امدادی قافلہ طرابلس کے مجاہدین کے لئے روانہ ہوا جس میں چار ہزار اونٹوں پر سامان رسد اور آلات جنگی تھے، طرابلس میں مسیحیت کی درندگی، خونریزی اور غارت گری سے تمام مسلمان کچھ ایسے متاثر تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ صلیبی جنگ کا پھر سے اعادہ ہو رہا ہے"[1] مولانا نے صرف الہلال کے ذریعہ ناموران غزوۂ طرابلس کی سرفروشیوں کے ایسے ولولہ انگیز واقعات لکھے جس سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی جوش کا طوفان اُبل پڑا، بلکہ عیسائی درندگی کی ایسی تصویریں شائع کیں جنھوں نے مسلمانوں کے خون میں جوش پیدا کر دیا، یہ مرحلہ ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ یورپ کی بڑی سلطنتوں کے اشارے پر بلقانی ریاستوں نے ترکی پر حملہ کر دیا، اور ترکی کو بلغاریہ، سرویا اور مانٹی نگروں کے خلاف اپنی زندگی اور بقا کے لئے جنگ لڑنی پڑی، ترک ہندوستانی مسلمانوں کو اسلام کے گذشتہ قافلہ جہانبانی کا آخری نقشِ قدم اور آفتاب اقبال کی آخری شعاعِ اُمید سمجھتے تھے، اسی لئے جب ایڈریانوپل میں ترکوں کی پسپائی کی خبر ہندوستان پہونچی تو مولانا کی زبان و قلم سے شعلے برسنے لگے، کلکتہ کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا :-

---

[1] صباح الدین - معارف نومبر ۱۹۵۹ء - صفحہ ۳۲۷

"اے عزیزانِ ملت اور اے بقیہ ماتم زدگان اسلام! اگر یہ سچ ہے کہ دنیا کے کسی گوشے میں پیروانِ اسلام کے سروں پر تلوار چمک رہی ہے تو تعجب ہے اگر اس کا زخم ہم اپنے دلوں میں نہ دیکھیں، اگر اس آسمان کے نیچے کہیں بھی ایک مسلم پیروِ توحید کی لاش تڑپ رہی ہے تو لعنت ہے ان سات کروڑ زندگیوں پر جن کے دلوں میں اس کی تڑپ نہ ہو، اگر مراکش میں ایک حامیٔ وطن کے حلق بریدہ سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا ہے تو ہم کو کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے منہ سے دل و جگر کے ٹکڑے نہیں گرتے، ایران میں اگر وہ گردنیں پھانسی کی رسیوں میں لٹک رہی ہیں جن سے آخری ساعت نزع میں اَشْہَدُ اَنْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کی آواز نکل رہی ہے تو ہم پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی پھٹکار ہو اگر اپنی گردنوں پر اس کے نشان محسوس نہ کریں، اگر آج بلقان کے میدانوں میں حافظین کلمۂ توحید کے سر اور سینے صلیب پرستوں کی گولیوں سے چھن رہے ہیں تو ہم اللہ، اس کے ملائکہ اور اس کے رسولؐ کے آگے ملعون ہیں، اگر اپنے پہلوؤں کے اندر ایک لمحہ کے لئے بھی راحت اور سکون محسوس کریں...... اگر میدانِ جنگ میں کسی ترک کے تلوے میں ایک کانٹا چبھ جائے تو قسم ہے خدائے اسلام کی کوئی ہندوستان کا مسلمان مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس کی چبھن کو تلوے کی جگہ اپنے دل میں محسوس نہ کرے، کیونکہ ملت اسلامیہ ایک جسم واحد ہے اور مسلمان خواہ کہیں ہو، اس کے اعضاد جوارح ہیں۔"[1]

[1] الہلال - ۲ر نومبر ۱۹۱۲ء - صفحہ ۱۰

اس آتش بیانی کے بعد ۲۷ ؍نومبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں عیدالاضحیٰ کے موقع پر انھوں نے لکھا:۔

"اسلام کی لذت اس بدبخت کے لئے حرام ہے جس کا ذوقِ ایمانی لذتِ جہاد سے محروم ہو اور زمین پر گو اس نے اپنا نام مسلم رکھا ہو لیکن اس کو کہہ دو کہ آسمانوں میں اس کا شمار کفر کے زمرے میں ہے" ان کے نزدیک وہ مسلمان لیڈر جو جہاد سے پہلو تہی کرنا چاہتے تھے "مفسدینِ ملت و دزدانِ متاعِ ایمانی" اور "غارت گرانِ حقیقتِ اسلامی" کے ناموں سے یاد کئے جانے کے قابل ہیں، اس لئے کہ "اسلام کی حقیقت ہی جہاد ہے، دونوں لازم و ملزوم ہیں، اس لئے کہ اگر جہاد کو الگ کر لیا جائے تو وہ ایک لفظ ہوگا جس میں معنی نہیں ہے، ایک اسم ہوگا جس میں مسمّیٰ نہیں ہے، ایک قشر ہوگا جس سے مغز نکال لیا گیا ہے[1]"

انھوں نے مسلمانوں کو بتلایا کہ:۔

"اس کا یہ بھی فرض دینی ہے کہ خلافتِ آلِ عثمان کے تعلق کو ایک خالص دینی رشتے کی طرح اپنے دل میں محفوظ رکھے اور دنیا کی جو حکومت اس کی دشمن ہو، اس کو اسلام کا دشمن اور جو اس کی دوست ہو اس کو اسلام کا دوست یقین کرے کیونکہ مسلمانوں کی دوستی اور دشمنی انسانی اغراض کے لئے نہیں بلکہ صرف دینِ الٰہی کے

---

[1] الہلال، ۲۷ ؍نومبر ۱۹۱۲ء

سے ہیں۔[1]"

مولانا کی ان تحریروں کے نتائج یہ نکلے کہ مسلمانوں کو تمام اہلِ یورپ اور خصوصاً انگریزوں سے نفرت ہو گئی انھوں نے جنوبی افریقہ میں ہونے والے واقعات کی ترجمانی بھی الہلال کے صفحات میں کی اور اس طرح قارئین فرنگی فتنہ و فساد و مکر و فریب سے واقف ہو گئے اور ان کے دلوں میں برطانوی حکومت کے خلاف غصہ اور اشتعال پیدا ہو گیا جس سے بہت دور رس نتائج برآمد ہوئے، مودت، اخوت اور اتحادِ اسلامی کا جو سبق مولانا نے الہلال کے ذریعہ قوم کو دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف ہندستان کے اندر بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ان کی گونج سنادی، ملک کے اندر جا بجا عظیم الشان جلسے منعقد ہوئے جس میں مسلمانوں نے غیر معمولی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا، خود کلکتہ کے اندر ۲ رفروری ۱۹۱۳ء کو ہالیڈے اسٹریٹ کے میدان میں تقریر کرتے ہوئے جب مولانا نے یہ الفاظ کہے:-

> "اب صرف دو ہی کام ہیں، جن کی طرف تم کو بلاتا ہوں، جیب میں مال ہے اسے بھیج دو اور جسم میں جان ہے اسے ہتھیلیوں پر تیار رکھو کہ جب کبھی کلمۂ الٰہی کو تمھاری ضرورت ہو، تو تم اس کی پہلی صدائے دعوت پر اپنی تڑپتی ہوئی لاشوں کا اضطراب اپنی گردنوں کے خون کا فوارہ پیش کر سکو۔"

تو جاں نثارانِ ملت نے اپنی جیبوں کو اُلٹ دیا، اور نوٹوں اور روپیوں کے ساتھ

---

[1] الہلال، ۶ رنومبر ۱۹۱۲ء - صفحہ ۲۰

صدائیں اٹھیں کہ جیب کی آخری متاع بھی حاضر ہے .... اس جلسہ میں پیسوں، اکنیوں، دو آنیوں سے تقریباً تیس ہزار روپے کی رقم فراہم ہوگئی۔ والنٹیروں کا گروہ جلسے کے بعد راستوں سے گذرا تو مکانوں کی کھڑکیوں سے عورتوں نے اپنے زیور پھینکنے شروع کر دیے، خود جلسے میں نہایت کثرت سے لوگوں نے اپنی گھڑیاں، انگوٹھیاں اور کپڑے اُتار کر دے دیے، یہاں تک کہ ایک شخص نے گاڑی اور گھوڑا تک پیش کر دیا[1]۔"

ہندوستان کے علاوہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی الہلال کی تحریرات کا خاطر خواہ ردِ عمل ہوا اور مضامین الہلال کے ترجمے ترکی زبان میں شائع کیے گئے۔ ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۱ھ کے ایک مکتوب میں ایڈریانوپل سے ایک مکتوب نگار نے لکھا :۔

"آپ ہندوستان میں بیٹھے اپنے قلم و زبان اور علم و فضل کو راہ ملت کر رہے ہیں لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ جو حروف آپ کے قلم سے نکلتے ان کے نقوش کہاں کہاں اور کن کن دلوں میں اپنا گھر بناتے ہیں، مئی سنہ رواں کے الہلال میں بعنوان "صفحۃ من تاریخ العرب" ایک عجیب و غریب سلسلۂ مضامین چھپا ہے .... وہ ایک جماعت کے مطالعے میں آیا اور اس نے پورے مضمون کا ترکی میں ترجمہ کرکے متعدد اخبارات میں شائع کر دیا .... کس قدر خوشی اور ناز کی بات ہے کہ ایڈریانوپل میں یہ مضمون صرف پڑھا ہی نہیں گیا ...... بلکہ

---

[1] الہلال۔ ۵ ر فروری ۱۹۱۳ء

اس پر پورا پورا عمل کیا گیا'...... تمام مسلم آبادی' کیا مرد کیا عورت' بلا لحاظ سن وسال قلعے اور مورچے تیار کر رہی ہے اور جو تصویر آپ نے اہل قرطاجنہ کے دفاع کی کھینچی تھی' وہ اس کی در و دیوار کے نیچے بجنسہٖ نظر آرہی ہے[1] ..."

۲۸ر جنوری ۱۹۱۴ء کے الہلال میں شاکر آفندی نے ان کو اسلامی ممالک میں آنے اور ان کی قیادت کرنے کی دعوت ان الفاظ میں دی :-

"گو عالم اسلامی کا ہر گوشہ تجھ جیسے خادمانِ ملت کے لئے بیقرار و منتظر ہے' مگر سب سے زیادہ میرا وطن .... تجھ جیسے شیدائی' تجھ جیسے جاں فروش کا زیادہ حقدار ہے ...... تیرے علم صداقت' تیرے لوائے حریت' تیرے برق انتقام کے سائے میں اناطولیہ کے وہ جوان ہوں گے جن کے رنگ گلاب کو شرماتے ہیں' چوڑے چوڑے سینے ہیں اور ان سینوں میں اسلامیت کا مقدس خون بھرا ہوا دل ہے .... بلقان کی زمین پر' طرابلس کے ریگستان پر' شہدا کا خون سوکھنے سے پہلے' معصوم بچوں کی ہڈیاں گلنے سے پہلے' بیوہ عورتوں کے ہلاک گریہ ہوجانے سے پہلے آ' اے اپنی دولت سعی کو ضائع کرنے والے آ' میری آنکھیں تیری فرش راہ ہوں گی۔ میرے لب قدم بوسی کا شرف حاصل کرنے کے آرزومند ہیں"۔

---

[1] الہلال ۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۱۳ء

لیکن چونکہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے محاذ پر رہنمائی کرنا مولانا کے لئے مقدر ہو چکا تھا اس لئے مسلمانوں کی دینی حمیت، ملی غیرت اور قومی بصیرت کا سہارا لے کر ابوالکلام نے آزادیٔ وطن کا وہ صور پھونکا جس سے برطانوی استبداد کی بنیادیں ہل گئیں۔"

(۱۰)

جد و جہد آزادی اور ہندوستانی مسلمان

مولانا نے یہ اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا کہ مسلمان مذہب کے نام پر کوہِ آتش فشاں بن کر پھوٹ سکتے ہیں، اور "اسی لئے انگریزوں کے کنگرۂ فرعونیت کو متزلزل اور ان کے "وقار نمرودیت" کو پامال کرنے کے لئے بھی انھوں نے قرآنی آیتوں اور مذہبی احکام ہی کا سہارا لیا[۱]۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں انھوں نے اپنے مضمون "وعظ یوسفی" کی ابتدا قرآن کی ان آیتوں سے کی:-

"اے یاران مجلس! بہت سے مالک اور آقا بنا لینا اچھا ہے یا ایک ہی خدائے قہار کے آگے جھکنا؟ تم جو اللہ کو چھوڑ کر اور معبودوں کو پوج رہے ہو تو یہ اس کے سوا کیا ہے کہ چند نام ہیں جو تم نے اور تمھارے پیش روؤں نے گھڑ لئے ہیں، حالانکہ خدا

---

[۱] صباح الدین - معارف نمبر ۱۹۵۸ء - صفحہ ۳۴۷

نے قرآن کے لئے کوئی سند بھیجی نہیں، اے گمراہو! یقین کرو روئے کی تمام جہان میں حکومت صرف ایک خدا ہی کے لئے ہے، اس نے ہزار حکم دیا ہے کہ صرف اسی کے آگے جھکو! یہی دین اسلام کا سیدھا راستہ ہے لیکن اسے واے کہ اکثر لوگ ہیں جو نہیں جانتے "

اور پھر انھوں نے یہ بشارت دی:۔

"جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی، یقیناً ایک دن آئے گا جبکہ ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا، غلامی کی وہ بیڑیاں جو اس نے خود اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی، اور وہ سب کچھ ہو چکا ہوگا جس کا ہونا ضرور ہے فرض کیجئے کہ اس وقت ہندوستان کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی، تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا جائے گا؟ اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بدبخت اور زبوں طالع قوم، جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لئے ایک روک، ملک کی فلاح کے لئے ایک بدقسمتی، راہِ آزادی میں سنگِ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا۔ دست احباب میں بازیچۂ لعب، ہندوستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم، اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی امنگوں کو پامال کرنے کے لئے ایک پتھر بن کر رہی، اس میں لکھا جائیگا کہ ایک قابلِ رحم مگر مسعود انسانوں کا گلہ جس کے ہر فرد کو کسی زبردست

"کا ہن نے اپنے منتر سے جانور بنا دیا تھا، جو اپنے نچانے والے آقا کے ہاتھ میں اپنے گردن کی رسی دیکھتی تھی اور خوش ہوتی تھی، جس میں کوئی انسانی ارادہ، کوئی انسانی دماغ، کوئی انسانی حرکت اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہ تھا جو نہ اپنے دماغ سے سوچ سکتی تھی، نہ اپنی آواز سے بول سکتی تھی نہ اپنے پاؤں سے چل سکتی تھی، ایک معمول جو مسمرائزر کے ارادے پر زندہ ہو، ایک وجود شل جو صرف زمین کے لئے بار ہو، ایک درخت جو حرکت کے لئے ہوا کا منتظر ہو، ایک پتھر جو بغیر کسی ذی روح کے حرکت دئے بغیر ہل نہ سکتا ہو، اور سب سے آخر یہ کہ ایک بدبختی کا داغ جو انسانیت کی پیشانی پر ہو"[1]

اور یہی نہیں بلکہ اسی مضمون میں آگے چل کر انھوں نے مسلمانوں کی غیرتِ قومی کو اس طرح تازیانہ لگایا کہ جب ہندوستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا، ہندوؤں نے اس کے لئے اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھا مگر مسلمان غاروں کے اندر چھپ گئے، انھوں نے پکارا، مگر انھوں نے اپنے منھ اور زبان پر قفل چڑھا دئے۔ ملک غیر منصفانہ قوانین کا شاکی تھا۔ ہندوؤں نے اس کے لئے جہاد شروع کیا پر اس قوم مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ صرف چپ رہی بلکہ مجنونانہ چیخ اٹھی کہ تمام کام کرنے والے باغی ہیں، اور اس کے آگے چل کر مولانا نے انگریزوں کے افسانۂ استبداد

---

[1] الہلال - ۱۸ دسمبر ۱۹۱۳ء

کو دہرایا ہے کہ اس زرعی ملک کے کاشتکار تباہ و برباد ہو رہے ہیں، ریلوے کی توسیع کے لئے انگلستان کو ٹھیکے دئے جا رہے ہیں، ملک کی تمام دولت ستّر ہزار سُرخ رنگ سپاہیوں کو سونا اور چاندی کھلا کر لٹائی جا رہی ہے، مگر ملک کے فاقہ مست تعلیم اور حفظ صحت کے انتظام سے محروم ہیں، نمک بھی ملتا ہے تو محصول دے کر، تعلیم بھی ملتی ہے تو گھر بار بیچ کر، اور ان حالات میں جب ہندو ملک اور ملک کی آزادی کی آگ سلگا رہے ہیں، تو یہ تعلیم کی ایک ٹھنڈی لاش بنے بیٹھے ہیں، الف لیلہ کے عفریت نے ان کو پتھر کی چٹان بنا دیا ہے اور پھر انھوں نے مسلمانوں کو بتلایا کہ ملک کی ترقی اور آزادی کی ذمہ داری تو ان کے سروں پر خدائے ذوالجلال کی طرف سے ہے دنیا میں صداقت کے لئے جہاد، اور انسانوں کو انسانی غلامی سے نجات دلانا تو اسلام کا قدرتی مشن ہے اور آخر میں انھوں نے کہا، "یاد رکھیے کہ ہندوؤں کے لئے ملک آزادی کے لئے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے، مگر آپ کے لئے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ"[1] اللہ نے ان کو اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق اور صداقت اور انسانی بند استبداد اور غلامی کو توڑنے کے لئے کی جائے، چنانچہ اسلام کی صحیح تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کی بے ہمتی، افسردگی خوف اور مرعوبیت کو دور کرنے کے لئے انھوں نے حزب اللہ کے نام سے ایک تنظیم بنانے کی کوشش کی، جس کے

---

[1] الہلال - ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء

مقاصد میں دینی اعتقادات و اعمال کی اصلاح و درستگی، انھیں اعتقاداً و عملاً ایک سچّا مسلمان، راسخ الاعتقاد مومن، اور اولوالعزم و بلند ارادہ مجاہد فی سبیل اللہ بنانے کی سعی کرنا بھی شامل تھا، انھوں نے یہ لائحہ عمل بنایا تھا کہ اس کی جماعت کے شرکاء فقیروں کی طرح نکلیں گے، دیوانوں کی طرح آوارہ گردی کریں گے، جہاں کہیں ٹھہریں گے خاکساروں کی طرح ٹھہریں گے، نہ تو وہ کسی سے نذر و نیاز لیں گے، اور نہ کسی پر ایک پیسہ کا بار ڈالیں گے، ضرورت کے مطابق ان کے کام ہونگے، عام دینی مسائل سے لوگوں کو باخبر کریں گے، تعلیم یافتہ اصحاب کے مذہبی تشکوک اور ملحدانہ خیالات کی اصلاح کریں گے، عام مجلسوں میں قرآن کریم کا درس دیں گے حدیث نبوی کی تعلیمات بیان کریں گے، انجمنوں میں، مسجدوں میں ایک واعظ کی طرح جائیں گے، ذکر میلاد کی مجلسوں میں مولود پڑھیں گے اور ہر موقع پر لوگوں کو اللہ کی طرف بلائیں گے، مساجد کی جماعت و جمعہ کا صحیح و شرعی انتظام اور اسلام سے ہر طرح کے فوائد و نتائج حاصل کرنا ایک بہت بڑا کام ہوگا، لیکن قبل اس کے کہ یہ جماعت عملی تشکل اختیار کرتی الہلال خود برطانوی حکومت کی زد میں آکر بند ہوگیا مگر اس کے باوجود الہلال مسلمانوں میں احساس بیداری، عمل بالاسلام اور جذبۂ حریت پیدا کرنے میں کامیاب ہوچکا تھا بقول مولانا آزاد :-

"اس نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کردی، وہ پہلے اپنے ہندو بھائیوں کی پولیٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے، بلکہ اس کی مخالفت کے لئے

بیوروکریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے، گورنمنٹ کی تفرقہ اندازپالیسی کی وجہ سے انھیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے، ہندوستان اگر آزاد ہوگیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہوجائے گی، مگر الہلال نے مسلمانوں کی تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہوکر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی اسی سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں، جن کا نتیجہ آج متحدہ تحریک (خلافت وسوراج) ہے۔ بیوروکریسی ایک ایسی تحریک کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کرسکتی تھی، اس لئے پہلے الہلال کی ضمانت ضبط کی گئی، پھر جب البلاغ کے نام سے دوبارہ جاری کیا تو ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے مجھے نظر بند کردیا۔ میں بتلانا چاہتا ہوں کہ الہلال تمام تر آزادی یا موت کی دعوت تھی...... ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی مذہبی زندگی میں جو روح پیدا کر رہے ہیں، الہلال اس کام سے ۱۹۱۲ء میں فارغ ہوچکا تھا۔"[1]

اپنے اسی بیان میں جو مولانا نے عدالت میں دیا تھا، مولانا نے ایک اور جگہ کہا:

"میں نے آج سے بارہ سال پہلے الہلال کے ذریعہ مسلمانوں کو یاد دلایا تھا کہ آزادی کی راہ میں قربانی و جاں فروشی ان کا قدیم اسلامی ورثہ ہے ان کا اسلامی فرض یہ ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں کو اس راہ میں

---

[1] قول فیصل۔ صفحہ ۱۰۵-۱۰۴۔ نیا ادارہ۔ دہلی

اپنے پیچھے چھوڑ دیں، میری صدائیں بیکار نہ گئیں، مسلمانوں نے اب
آخری فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے ہندو، سکھ، عیسائی اور پارسی بھائیوں
کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائیں[1]"

اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اس وقت بقول یوسف مہر علی، صرف الہلال ہی ایک ایسا اخبار تھا جو حکومت کی پالیسی پر بے باک نکتہ چینی کر رہا تھا، الٰہ آباد کے نیم سرکاری اخبار پائنیر کو تو الہلال کی تحریروں نے حواس باختہ کر دیا، انگلستان کی پارلیمان میں سوالات کئے گئے اور آخر کار جریدۂ مذکور کی ضمانت کا مطالبہ کیا گیا[2]۔ لیکن اس کے باوجود بھی بے شمار مشککین، مذبذبین اور تارکین المال والاحکام راسخ اعتقاد مومن، صادق الاعمال مسلم اور مجاہد فی سبیل اللہ مخلص ہو گئے، ان کا انداز تخاطب ایسا تھا کہ جس سے بقول پنڈت جواہر لال نہرو ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے[3]"۔

وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجہ سے واقف تھے اور سر سید، محسن الملک، نذیر احمد اور حالی کے انداز بیان کے علاوہ کوئی زیادہ گرم جھنجھکار تک پہونچا ہی نہ تھا۔ الہلال مسلمانوں کے کسی مکتبۂ خیال سے متفق نہ تھا وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا، وہ پہلے ہی دن سے ہندوستان کی ایک متحدہ قومیت کا علم بردار تھا۔
اس نے ایسے افکار کی اشاعت کی جس نے علی گڑھ کی روایات کی بنیاد کو ہلا دیا۔
چنانچہ الہلال کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے پنڈت نہرو لکھتے ہیں:۔

---

[1] قول فیصل۔ صفحہ ۱۰۰ [2] ابوالکلام آزاد، مرتبہ عبداللہ بٹ۔ صفحہ ۱۰۹
[3] DISCOVERY OF INDIA PAGE 289

[A]K KALAM AZAD ATTACKED THIS (ALIGARH) ST-RONGHOLD OF CONSERVATION AND ANTINATIONALISM NOT DIRECTLY BUT SPREADING IDEAS WHICH UNDERMINED THE ALIGARH TRADITIONS.

HIS WORD CREATED A FERMENT IN IEMINDS OF THE YOUNGER GENERATION. THAT FERMENT HAD ALREADY STARTED BECAUSE OF EVENTS IN TURKEY, EGYPT & IRAN, AS WELL AS THE DEVELOPMENT OF THE INDIA NATIONALIST MOVEMENT. AZAD GAVE A DEFINITE TREND TO IT BY POINTING OUT THAT THERE WAS NO CONFLICT BETWEEN ISLAM AND SYMPATHY FOR ISLAMIC COUNTRIES & INDIAN NATIONALISM.[1]

اور یہی نہیں بلکہ جب محمد علی کامریڈ کے ذریعہ علی گڑھ کی سیاسی تحریک کا ساتھ دینے لگے تو اجودھیا میں قربانی گاؤ کے مسئلے پر انھوں نے حکیم اجمل خاں اور محمد علی دونوں سے تصادم مول لے لیا اور اس کے بعد مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ پر مولانا کے احساسات

DISCOVERY OF INDIA PAGE 290 SIGNET PRESS CALCUTTA [1]

اور کبھی گرم ہو گئے اور اس کے بعد ان دو زبردست شخصیتوں میں بار بار تصادم ہوتا رہا، لیکن مولانا کا پلہ اس لئے بھاری رہتا تھا کہ بقول قاضی عبدالغفار "علم و فضل کا وزن محمد علی کی شخصیت کو حاصل نہ تھا جس نے مولانا کے قلم کو قوت بخشی تھی"[1]

الہلال کے صفحات پر قومی اور مذہبی مسائل زیر بحث آتے رہے، اصلاح ندوہ کی بحث، اخبار زمیندار کی ضبطی ضمانت اور صحافت آزادی کا مسئلہ اور سب سے زیادہ مسجد کانپور کے انہدام کا حادثہ اور جنگ بلقان اور ممالک اسلامی کے متعلق خبروں اور مضامین کا سلسلہ اور ایسے ہی بہت سے مباحث تھے جن سے مولانا نے اپنی قوم کے احساسات کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنے کے لئے ایک وسیع میدان پیدا کیا اور مذہبی مباحث میں قدیم مفسرین اور متکلمین کے طریق استدلال سے ہٹ کر اپنا عقلی استدلال اور مجتہدانہ نظریہ اس طرح پیش کیا کہ تقلید کی زنجیریں پاش پاش ہو گئیں اور مذہب و اخلاق کے معاملے میں بھی عقل کے بند دروازے کھل گئے، "الدین والسیاست" "الاصلاح والافساد" "فلسفۂ اجتماع اور جنگ" "جنگ کا اثر فن روایت پر" "تربیت عسکری اور قرآن" اور ایسے بہت سے مستقل مضامین کے ساتھ ساتھ استفسارات کے وہ جوابات ہیں جن میں مولانا نے اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت فرمائی ہے۔ "حجت ابراہیمی" "اسلام اور سزائے قتل" "کفار اور کفر کی نوعیت" "مذہبی حملوں کی روک تھام" کے مسائل پر مولانا کوئی فتویٰ دینے کے بجائے عقلی اور استدلالی نقطۂ نظر اس انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قارئین کے دلوں

---

[1] آثار ابوالکلام ۔ صفحہ ۳۵ ۔ آزاد کتاب گھر ۔ دہلی ۱۹۵۸ء

میں اپنا گھر کر جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا کی کوئی بھی تعلیمی صداقت ایسی نہیں ہے جس کے پیروؤں کا فہم و عمل حجت قرار دے کر ہم حقیقت کی طرف قدم بڑھا سکتے ہوں، ان کا خیال تھا کہ وہ تمام لوگ جو حقیقت و صداقت کے متلاشی نہیں ہوتے بلکہ کسی خاص خیال اور جذبہ سے اپنی کوئی بات منوانی اور دوسرے کی کوئی بات گرا دینی چاہتے ہیں "طریقِ جدل" پر عامل ہوتے ہیں اور ہمیشہ اس ڈھونگ میں لگے رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوا دیں۔"

۱۹۲۷ء میں جب الہلال کا سلسلہ پھر سے شروع ہوا تو مولانا نے الہلال کے مقاصد کی تشریح یوں کی، " الہلال جب ۱۹۱۲ء میں نکلا تو اس کے پیشِ نظر کچھ مقاصد تو خاص قسم کے تھے، اور کچھ عام قسم کے، عام مقاصد کا تعلق علم و ادب اور سیاست و صحافت کے عام مباحث سے تھا اور مقصود یہ تھا کہ اردو زبان میں ہر اعتبار سے ایک ایسا بلند پایہ رسالہ وجود میں آئے جو زمانے کی رفتار و ترقی کا ساتھ دے سکے، اور فکر و نگارش کے ہر میدان میں ایک نئی قسم کی بلندی پیدا کر دے خاص مقاصد کا تعلق اس کی دعوت سے تھا، وہ دعوت جو ہر مذہب میں مجتہدانہ نظر و فکر کا ایک نیا دروازہ کھولتی تھی، اور سیاست میں آزادیٔ فکر و عمل اور علوئے نظر و رائے کی طرف مسلمانوں کو لے جانا چاہتی تھی،...... بہر حال اس کے مقاصد کا ایک حصہ دعوت تھا اور یہ خاص تھا، ایک حصہ علم و ادب اور صحافت و کتابت کے اعلیٰ نمونوں پر مشتمل تھا اور یہ عام تھا، اس کی دعوت نے اگر قوم کی سیاسی و دینی ذہنیت (مینٹیلٹی) میں انقلاب پیدا کرنا چاہا تھا تو تحریر و کتابت نے اردو ادبیات کی رفتار بدل دینی چاہی تھی[1]"

---

[1] الہلال - ۲۴ رجون ۱۹۲۷ء

مولانا ہندوستان کے اندر الہلال کے ذریعہ مسلمانوں کو انگریزوں کے زیر سایہ مکمل حکومت خود اختیاری حاصل کرنے کے لئے پُر امن جدوجہد پر آمادہ کر رہے تھے اور اس جدوجہد کو انھوں نے اسلامی فریضہ کی حیثیت سے پیش کیا تھا وہ لکھتے ہیں :-

"قرآن انتظام عالم کے لئے ضروری سمجھتا ہے کہ شخصی استیلا و اقتدار کی مخالفت کرے ...... پس مسلمانوں کا فرض ہونا چاہیئے کہ وہ آزادی کے حصول کے لئے کوشش کریں اور پارلیامنٹری حکومت انھیں جب تک نہ مل جائے اپنے اصول مذہبی کی خاطر چین نہ لیں، یہ اصول ہیں جن سے ہم اپنی پولٹیکل پالیسی تیار کرسکے ہیں اور جس کے لئے ہمیں نہ تو ماڈریٹ ہندوؤں کی کاسہ لیسی کی ضرورت ہے اور نہ ا کسٹریمسٹ کی، اگر ہم ایسا کریں تو ایک اعتدال پسند بے خوف جماعت ہوں گے اور ہم سے کسی فریق کو ضرر اور نقصان کا خوف نہ ہو گا ہم بالکل اپنے مذہبی اصول کے مطابق ملک کی ترقی اور آزادی کے لئے سعی کریں گے، لیکن ہماری سعی فتنہ و فساد اور شورش و بغاوت سے پاک ہو گی، قرآن نے ہم کو سکھلایا ہے کہ ...... لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (امن کے بعد زمین پر فساد نہ پھیلاؤ) برٹش گورنمنٹ نے یقیناً ہم کو امن دیا ہے اور اس امن میں ہم آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی فرائض انجام دیتے ہیں بس اب باغیانہ شر و فساد اور مغویانہ قانون شکنی، اصلاح کے بعد زمین کو آلودہ فساد کرنا ہو گا اور یہ خدا کا جرم اور عصیاں ہے ...... گورنمنٹ کو بھی یاد رکھنا چاہیئے ...... کہ اسلام نے ہم کو آزادی بخشنے اور آزادی حاصل کرنے، دونوں کی تعلیم دی ہے، ہم جب حاکم تھے، تو ہم نے

آزادی دی تھی اور اب ہم محکوم ہیں تو وہی چیز طلب کرتے ہیں...... ہمارا جوش و ایجی ٹیشن قانون اور امن کے حدود کے اندر رہوگا۔[1]

۱۹۲۷ء میں بھی الہلال کے مقاصد بنیادی طریقہ پر وہی تھے جو ۱۹۱۲ء میں تھے، لیکن مولانا کو یہ احساس تھا کہ "دنیا اور دنیا کے ساتھ ہندوستان گیارہ برس آگے بڑھ چکا ہے" وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"۱۲ء اور ۲۷ء کے درمیان تغیر و ترقی کی ایک بڑی مسافت حائل ہے تاہم جہاں تک الہلال کے عام و خاص مقاصد کا تعلق ہے، صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اس لئے اب بھی اس کی "دعوت" کے لئے وقت کی احتیاج راہ تک رہی ہے اور اس کی تحریر و کتابت اور آرائشِ اوراق و صحائف کی جگہ بزمِ سخن میں خالی ہے، البتہ حالات کی تبدیلی نے سفر میں نہیں لیکن منزل کے محل میں ضرور تبدیلی کردی ہے، پہلے اس کا سفر ابتدا کے نقطہ سے شروع ہوا تھا تو اب بعد کی منزلوں سے شروع ہونا چاہیے، پہلے دعوت کی ضرورت اس لئے تھی کہ راہ کھلے اور سفر شروع ہو اب کہ دروازہ کھل چکا ہے اور وقت بھی رسم و راہ سفر سے نا آشنا نہ رہے اس کی صدائیں اس لئے مطلوب ہیں کہ راہ کی مشکلیں حل کی جائیں، اور سعی و طلب کے جو قدم اُٹھ چکے ہیں وہ بے راہ روی سے محفوظ رہیں...... اس سلسلے میں خصوصیت

---

[1] الہلال ـ ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء

کے ساتھ تین موضوع وقت کی ضروریات کے اصلی موضوع ہیں اور اس لئے الہلال کے صفحات پر ان کا خصوصیت کے ساتھ انتظار کرنا چاہیے۔

۱۔ ملک کی موجودہ سیاسی زندگی کے عملی مسائل۔

۲۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا موجودہ ذہنی اور عملی انتشار جو پچھلی حرکت کے ردِ فعل (ری ایکشن) کی صورت میں نمایاں ہوا، اس کے عملی مسائل و مباحث۔

۳۔ مسلمانانِ ہند کی قومی و اجتماعی ذہنیت کی تشکیل اور اس کے اہم مباحث[1]

لیکن علم زندگی سیاست کی زندگی سے کچھ اس طرح مختلف واقع ہوئی ہے کہ دونوں کا ایک ہی وقت اور ایک ہی محل پر جمع ہونا بہت مشکل ہے چنانچہ مولانا کی کوشش کے باوجود چھ ماہ کی قلیل مدت میں یہ رسالہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

(۱۱)

الہلال کا اسلوب تحریر

الہلال کے طرز فکر اور اس کی دعوت کو عالم اسلام میں جو مقبولیت حاصل ہوئی ہے اس کا دارومدار اس اسلوب تحریر پر ہے جس کی تشکیل میں مردانہ وقار، فتح کر لینے کا عزم اور چھا جانے والی ادا کی کارفرمائی تھی، اور مولانا کا یہی مخصوص انداز تحریر جو ان کے قبل اردو کے کسی انشاء پرداز کو میسر نہ ہوا۔ ہمارے ادب کو مولانا کی ایک نئی دین

---

[1] الہلال - ۱۰ رجون ۱۹۲۷ء

تھی جس میں شگفتگی اور رنگینی کے ساتھ ساتھ بڑی جان اور بڑی توانائی بھی شامل تھی، عابد رضا بیدار کی یہ رائے بڑی حد تک صحیح ہے کہ الہلال کے اکثر معاصرین خصوصیت کے ساتھ "وکیل، زمیندار، مسلم گزٹ، پیسہ اخبار، مشرق، حبل المتین، مسلمان، الحکم، وطن، ہمدرد اور انگریزی کامریڈ سب کے سب پان اسلامی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے اور اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں لکھتے وقت الہلال کا انداز ان اخباروں سے بالکل مختلف نہ تھا"[1] لیکن اس کے باوجود قارئین کے ذہنوں کی تربیت میں جو کارنامہ الہلال نے انجام دیا وہ اس کے کسی دوسرے معاصر کے حصّہ میں نہ آیا۔ اور اس کی سب سے بنیادی وجہ وہ مخصوص طرز تحریر تھا جو مولانا کی اپنی ذاتی اور نجی جاگیر بن گیا تھا مولانا کے اس طرز تحریر میں مختلف اثرات وعوامل نے گھل مل کر ایک ایسا کیمیاوی مرکب تیار کر دیا تھا جو مجموعی طور پر مسلمانوں کے انحطاط پذیر معاشرہ کے لئے مولانا کا اپنا ذاتی اور نجی نسخہ شفا بن گیا تھا، لیکن اگر ان کے اجزائے ترکیبی کو الگ الگ کر دیا جاتا تو شاید وہ مریض قوم کی صحت کی بحالی کے لئے مفید ثابت نہ ہوتا، اس مخصوص طرز تحریر میں مولانا کی رومانی تخیل کے علاوہ افغانی اور عبدہٗ کا صحافتی انداز، شبلی کے جمالیاتی ذوق، سرسید کی اصلاحی تحریک اور محمد حسین آزاد کے استعارات وتشبیہات کی کارفرمائی کے ساتھ ساتھ قرآن اور انجیل کے لب ولہجہ کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے، انھوں نے مختلف کیاریوں سے پھول توڑے تھے، مگر سب کو ملا کر ایک ایسا حسین اور خوبصورت گلدستہ تیار کیا تھا جس پر ان کا

---

[1] عابد رضا بیدار۔ اردو ادب آزاد نمبر۔ صفحہ ۱۲۹

انفرادیت کی مہر لگ گئی تھی، اس گلدستہ کے پھولوں کو اگر الگ الگ کر دیا جاتا تو اس کے اندر شاید وہ تاثر نہ پیدا ہوتا، جو مولانا نے سب کو یکجا کر کے پیدا کیا تھا۔ العروۃ الوثقیٰ کا جذباتی اُتار چڑھاؤ سے پُر خالص خطیبانہ اور مرعوب کن لب و لہجہ شبلی کے فارسی اور عربی مذاق کے ساتھ ساتھ آرٹ، موسیقی اور جمالیات سے وابستگی محمد حسین آزاد کی آبِ حیات اور نیرنگِ خیال کی گونج کے ساتھ ساتھ قرآن کا خداوندی لب و لہجہ، ان سب کا اتنا حسین اور متوازن امتزاج مولانا کے طرزِ تحریر میں نمودار ہوا تھا، جو ان کے علاوہ کسی اور کو نصیب نہ ہو سکا، جھنجھلا کر جھنجھوڑنے کا انداز اور قرآنی آیات کا استعمال مولانا نے افغانی کی تحریروں سے سیکھا تھا اس لئے کہ یہ طرزِ نگارش ان کی طاقتور انا نے نہ صرف پرانے تقلیدی مسلمات کو رد کیا تھا بلکہ دنیا کو اپنے جذب و شوق کے سانچے میں ڈھالنے کی آرزو بھی کی تھی، حال ان کے سامنے ایک تکلیف دہ سچائی کی طرح پڑا تھا، سولہ، سترہ برس کی عمر میں ان کی نیند اچاٹ ہو چکی تھی، اور اگر آتی تھی تو نہایت ہی وحشت انگیز خوابوں میں کٹتی تھی۔ ایسے خواب جو ان کے دماغی التہاب کا ٹھیک ٹھیک عکس تھے وہ فرماتے ہیں:۔

"میں نے لق و دق صحرا دیکھا جس میں نہ ایک درخت تھا اور نہ کہیں سایہ اور نہ کوئی حد و انتہا، اچانک ریگستان میں آندھی آئی اور میں اس میں چھپ گیا، سمندر دیکھا، میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں اور موجیں مجھے اُچھال رہی ہیں[1]"

---

[1] آزاد کی کہانی، صفحہ ۴۲۳

حال کے اسی بے برگ و بار صحرا اور سمندر میں، ان کو ایک ایسے ہاتھ کی تلاش ہوئی جو اس تپتے ہوئے ریگستان سے نکال کر انھیں ایک ایسے نخلستان میں پہونچا دے جہاں جمالیاتی ناآسودگی کا شدید احساس ختم ہو جائے، اور اس فردوس گمشدہ کی بازیافت ہو جائے جس کا آئینہ خانہ خود ان کی پرچھائیوں سے معمور ہو، اور جہاں حقیقتیں خود ان کی شخصیت کے سانچے میں ڈھل گئی ہوں، اسی رومانوی جذبہ نے ان کے اندر انقلاب کی آرزو پیدا کی اور تقلیدی اور رسمی بندشوں سے آزاد کرایا، حال کی محرومی اور پستی کا تصور انھیں الہلال میں دعوتِ دار و رسن پر آمادہ کرتا ہے تاکہ ایک جہانِ تازہ کی تخلیق ہو سکے ـــــ ایسا جہانِ تازہ جس میں دوم درجہ کی کوئی چیز نہ ہو، جس میں وہ تہذیبی فضا چھائی ہو جو اسلام اور مسلمانوں کی رنگا رنگ دینی، ادبی اور عقلی روایات سے چھن کر نکلی ہو اور جس کی تشکیل خود انھیں کے طرز و طور، عقاید و افکار اور مذہب و مشرب نے کی ہو، "اور ظاہر ہے کہ ان کا مذہب اسلام، ان کا مشرب وہ ذوقی نظام عادات ہے جو ان کو اپنے ادبیات خصوصاً فارسی ادب کے ان اذواق سے حاصل ہوا ہے جو ہندوستان کے دورِ مغلیہ کا تہذیبی ورثہ ہے[1]۔"

"مسلمانوں کے لئے تمام عالم میں صرف ایک ہی ہاتھ ہے جو رہنما ہو سکتا ہے، ایک ہی چشم نگراں ہے جو لغزشوں سے بچا سکتی ہے۔"

---

[1] سید عبداللہ، ماحول آزاد نمبر۔ ستمبر ۱۹۶۰ء

یہ وہی ہے جو کبھی کوہِ سینا پر تجلّیِ حق بن کر چمکی، کبھی فاران پر ابرِ رحمت بن کر نمودار ہوئی، کبھی غارِ ثور میں لا تحزن ان اللہ معنا کی صدا میں تھی، کبھی بدر کے کنارے ان ینصرک اللہ فلا غالب لکم کے پیغام میں تھی، کبھی اُحد کے دامن میں وکان حقاً علینا نصر المومنین کی بشارت تھی اور آج ایک لٹے ہوئے کارواں، ایک برباد شدہ قافلہ اور ایک برہم شدہ انجمن کے لئے اُمید کا آخری سہارا اور زندگی کی آخری روشنی ہے۔"[1]

اور اگر یہی روشنی جس سے مولانا نے اپنی فکر و نظر کی قندیلوں کو روشن کیا بجھ جائے تو دنیا کی تمام تر مادی ترقیوں کے باوجود خوابوں کے اس جزیرہ میں اندھیرا چھا جائے جس کے حاصل کرنے کے لئے ابوالکلام کی ساری شخصیت ایک صاعقہ بردوش تڑپ بن گئی تھی، اور ان کی تحریروں میں شوکتِ بیان اور جوش و خروش کا ایک سیلاب اُمنڈ آیا تھا، وہ لکھتے ہیں:

"اگر مسلمانوں نے اپنے لئے ایک نہایت آزادانہ پولٹیکل پالیسی تیار کرلی، کانگریس سے بھی بہتر ایک پروگرام ان کے ہاتھ میں ہوا، آئرلینڈ کے حکومت طلبوں سے بھی بڑھ کر جوش و سرگرمی پیدا کرلی، پالٹیکس میں وہ از سرتاپا غرق ہوگئے، ان کا ہر فرد "گلیڈ اسٹون" اور "مارلے" ہوگیا، لیکن ساتھ ہی اگر انھوں نے اپنے معتقدات اور اعمال کے اندر اسلام کی عملی روح نہ پیدا

---

[1] الہلال ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء

کی، اپنے تئیں دین الٰہی کی سلطنت کے ماتحت داخل نہ کیا اور خشیتہ الٰہی اور زاد تقویٰ سے محروم ہے تو میں اس یقین کی لازوال طاقت کے ساتھ جس میں کبھی موت اور شکست نہیں اس نصرت الٰہی کے ساتھ جس میں کبھی تزلزل اور تذبذب نہیں ازسرتاپا صدائے ربانی بن کر کہتا ہوں کہ اگر آگ جلاتی ہے اور پانی ڈبوتا ہے اگر آفتاب مشرق میں نمودار ہوتا ہے اور مغرب کی جانب غروب ہوتا ہے، اگر مچھلی خشکی میں اور پرندہ دریا میں نہیں رہ سکتا، اگر قوانین فطریہ اور نوامیس طبیعہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی، اگر یہ سچ ہے کہ دو اور دو پانچ نہیں بلکہ ہمیشہ چار ہوتے ہیں تو یہ کبھی نہ مٹنے والی صداقت صفحہ کائنات پر نقش سنگی ہے کہ مسلمانوں کی یہ تمام بڑی ہی سیاسی ہنگامہ آرائیاں، تعلیم و تربیت کا غوغائے محشر خیز اور پولٹیکل پالیسی کے تغیر اور تبدل کا ہیجان ایک لمحہ، ایک دقیقہ، ایک عشیر دقیقہ تک کے لئے بھی کچھ نفع نہیں پہونچا سکے گا۔[1]

مولانا ابوالکلام کی یہی رومانیت جس میں سیاسی تفکر، آزادیٔ حق گوئی اور انفرادی انا کا احساس یکجائی اکٹھا ہو گیا ہے، دوسرے رومانی ادیبوں کے مقابلے میں ان کو "روسو" سے زیادہ قریب کرتا ہے اور دونوں کو یہاں بڑے ترمیمی اور ذہنی اور روحانی رشتے اور رابطے معلوم ہوتے ہیں، روسو کی طرح

---

[1] الہلال، ۱۰ر اکتوبر ۱۹۱۳ء

ان کی طبیعت کا بھی یہ اقتضا تھا کہ تقلیدی اور رسمی بندھنوں میں جکڑے ہوئے اداروں کو بدلیں اور انقلاب کی دعوت دیں، مگر یہ آزادی بے قید نہیں تھی بلکہ اپنا علیٰحدہ نیا نظام رکھتی تھی جس کے اندر وہ کمروہ پنپ سکے، اور یہ نظام مولانا کی شدید دینی اور مذہبی حس اور عشقِ رسول کی جنوں آمیز روایات سے معمور تھا، اور جو خدا کی ہستی میں گہرا اعتقاد اور قرآنی آیات کی صداقت میں محکم عقیدہ رکھتا تھا، اور یہی چیز ان کو "رومو" سے بالکل جدا بھی کردیتی ہے، ابوالکلام کے جذب وجنوں کے بعض رنگ عام رومانیوں کے سے ضرور ہیں مگر بقول ڈاکٹر سید محمد عبداللہ "اس جنون وآشفتگی کے سرچشمے وہ نہیں جن کا دوسروں کے جنوں کے سلسلے میں سراغ لگایا گیا ہے، ابوالکلام کی دیوانگی ان دوسروں سے مماثل ہونے کے باوجود اپنے ہی سلسلے کی چیز ہے جو ان کے مذہب اور ان کے مشرب نے دیا ہے"[۱] ان کی شخصیت ان کے جذبے کی آگ سے صحرا میں ایک تناور درخت کی طرح جلتی ہے، وہ ایک ہی بات کو جدا جدا رنگ سے بار بار کہتے ہیں، "الفاظ والوان کی نئی ترتیب اور تراشے آہنگ سے دُہراتے ہیں تاوقتیکہ ان کا جذبہ آسودہ نہ ہوجائے اور ان کے سینے کا صنم کدہ اظہار کی تسکین سے آسودہ نہ ہوجائے"[۲]۔

"میں وہ صور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کردے، میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں کہ ان کی سینہ کوبی کے شور سے سرگشتگانِ خواب موت

---

[۱] ڈاکٹر سید عبداللہ ماحول آزاد نمبر ستمبر ۱۹۵۸ء [۲] ڈاکٹر محمد حسن اردو ادب میں رومانوی تحریک - صفحہ ۳۱

ہوشیار ہو جائیں، آہ کہاں ہیں وہ آنکھیں جن کو درد دلت میں خونباری
کا دعویٰ ہے، کہاں ہیں وہ دل جن کو زوالِ امت کے زخموں پہ
ناز ہے، کہاں ہیں وہ جگر جو آتشِ غیرت و حمیت کی سوزش سے
لذت آشنا ہوں، اور پھر آہ کہاں ہیں اس برہم شدہ انجمن کے
ماتم گسار اس برباد شدہ قافلہ کے نالہ ساز، اس صفِ ماتم کے
فغاں سنج اور اس کشتیٔ طوفاں کے مایوس مسافر جن کی موت و حیات
کے آخری لمحے جلد جلد گزر رہے ہیں اور وہ بے خبر ہیں یا خاموش
روتے ہیں یا مایوسی سے چپ در راست نگراں، مگر نہ ان کے ہاتھوں
میں اضطراب ہے نہ پاؤں میں حرکت، نہ ہمتوں میں اقدام نہ ارادوں
میں عمل کا ولولہ، دشمن شہر کے دروازوں کو توڑ رہے ہیں اور اہل شہر
رونے میں مصروف ہیں، ڈاکوؤں نے قفل توڑ دیئے ہیں، اور
گھر والے سوتے ہیں...... لیکن اے رونے کو ہمت اور مایوسی
کو زندگی سمجھنے والو یہ کیا ہے کہ تمھارے گھر میں آگ لگ چکی ہے،
ہوا تیز ہے اور شعلوں کی بھڑک سخت ہے مگر تم میں سے کوئی نہیں
جس کے ہاتھ میں پانی ہو، پھر اگر اسی وقت کے منتظر تھے تو کیا
نہیں سنتے کہ وقت آگیا ہے؟ اگر تم کشتی کے ڈوبنے کا انتظار کر رہے
تھے تو نہیں دیکھتے کہ اب اس میں دیر نہیں۔ اور آہ مسلمانوں کے
عروج و زوال کی سیزدہ صد سالہ کشتی جو بارہا ڈوبی اور بارہا اُچھلی
اور نہیں معلوم کہ اب ڈوبنے کے بعد ہمیشہ کے لئے سطحِ عالم سے ناپید

ہو جاتی ہے یا اس کے ٹوٹے ہوئے تختے اور تار تار بادبان کے
ٹکڑے سمندر کی موجوں کا مقابلہ کرتے ہیں ۔ وہ دور کا رماست نالہ و
مادر ہوائے او" پروانۂ چراغِ مزار خودیم ما ۔

اُردو نثر نگاری میں یہ تڑپ اور یہ للکار جو الہلال کے ذریعہ پیدا ہوئی وہ بالکل نئی چیز تھی، یہ اسلوب جدید اور یہ انداز تو عوام کی ذہنیت پر مصنف کی انفرادیت کے تازیانے مارتا ہے اور انھیں جھنجھوڑ کر بیدار کرتا ہے اور جب مولانا کا جذبۂ صادق عوام کے جمود سے مجروح ہوتا ہے تو ان کی انفرادیت اس جمود سے پیدا ہونے والی افسردگی کو سقراط کے جام کی طرح پی جاتی ہے اور ان کی آواز ایک صدائے ربانی معلوم ہونے لگتی ہے، رشید احمد صدیقی کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ مولانا کی طبیعت پیغمبری کے رول سے اتنی سازگار نہ تھی جتنی خدا کے رول سے، خدا پیغمبروں کی طرح انسانوں میں گھلا ملا نہیں ملتا، اس لئے کہ پیغمبروں کی طرح وہ انسانوں میں نہیں ہوتا، اس لئے خدا کے خطاب کرنے کا انداز پیغمبر یا انسان کے طرزِ خطاب سے جداگانہ ہوتا ہے[1] ۔

مولانا کی انفرادیت نے انھیں عوامی زندگی سے زیادہ قریب کبھی نہ ہونے دیا، اور ان کے ذہنی اور روحانی خلوت خانے کے دروازے عوام کے لئے کبھی پوری طرح نہ کھل سکے، اسی لئے انھوں نے الہلال کا اب ولہجہ اور زور کلام پاک سے لیا، اور براہِ راست قرآن پاک کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا۔ وہی انداز بیان، وہی زور کلام اور وہی تہدید کے رہی تانہ پانے جو پیغامبروں پہ

---

[1] رشید احمد صدیقی، ماحول آزاد نمبر ۱۹۰۰ء

رعشۂ سیماب طاری کر دیں"۔ الہلال کے صفحات میں نظر آتے ہیں اس میں وہ نرمی اور نوازش نہیں ہے جو پیغمبروں کی دعوت میں ملتی ہے، قرآن کریم میں ایک ہی بات کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

"اس کی علت پر تدبر کیجئے کہ کیا تھی، فرمایا کہ دیکھو ہم آیتوں کو کس طرح پھیر پھیر کر مختلف طرح اور مختلف اطراف و نتائج کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ تاکہ لوگ سمجھیں اور عقل و بصیرت حاصل کریں"۔

اسی اعادہ اور تکرار سے وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ بجلی بھی گرا سکتے ہیں، اور موتی بھی لٹا سکتے ہیں، پھول بھی برسا سکتے ہیں اور انگارے بھی، اسی قرآنی لب ولہجہ کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کو غلبۂ حق کا یقین دلایا، اور ان کے دلوں میں ایمان راسخ پیدا کیا، قرآنی تعلیم کی ترویج، احکام شریعت کی اشاعت، طرابلس کے مظلوم مسلمانوں کے لئے تڑپ، ترک شہیدوں کا ماتم، غرضیکہ الہلال میں سبھی کچھ انھوں نے اسی خداوندی لب ولہجہ میں کیا، اور یہی وجہ ہے کہ قرآنی آیات ان کی عبارت میں اس طرح پیوستہ ہو جاتی ہیں جس کی مثال کسی دوسرے ادیب کے یہاں نظر نہیں آتی، مولانا انھیں آیتوں کے ذریعہ اپنی تحریریں مزید عظمت، جلال، حسن اور دلکشی پیدا کر لیتے ہیں اور پیرایۂ بیان میں تاثر اور بلاغت بھر دیتے ہیں، بلاغت قرآنی کا اتنا اثر کسی دوسرے ادیب کی تحریر میں نہیں ملتا، پورا الہلال قرآنی آیات کی صدائے بازگشت سے لبریز ہے۔ قرآنی آیات کے علاوہ مولانا کے حافظے میں بیشمار فارسی اشعار محفوظ تھے انھوں نے ان دونوں کو تاثر اور شاعری کا نہایت انگیز اور رنگا رنگ مطالعہ کیا اور اسی

شاعری کا خاطر خواہ فائدہ انھوں نے الہلال کے صفحات میں اُٹھایا ہے وہ اپنی تحریروں میں جا بجا اشعار کا استعمال اس حسن و خوبی سے کرتے ہیں کہ ان کی تحریر میں جان پڑ جاتی ہے، اور اتنے مناسب مواقع پر یہ اشعار صرف ہوتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ اسی محل کے لئے کہے گئے ہیں۔

قرآنی لب و لہجہ سے مستفید ہونے کی بنا پر ان کی تحریروں میں ایک مقرر آتش نفس کا خطیبانہ انداز پیدا ہو جاتا ہے، وہ جب مسلمانوں میں ایمانی حرارت اور ملّی حمیت پیدا کرنے کے لئے قلم اُٹھاتے ہیں تو بغداد و قرطبہ کا جاہ و جلال اور شیراز و اصفہان کا حسن و جمال ان کی تحریروں میں منتقل ہو جاتا ہے، اور ان کی تحریر میں تقریر اور تقریر میں تحریر کا مزا ملنے لگتا ہے، اسی خطیبانہ انداز کی بناء پر انھوں نے سمٹی ہوئی چیزوں کو بار بار پھیلا کر املناب کے ساتھ پیش کیا ہے الفاظ کے لشکر امنڈ امنڈ کر ان کے قلم سے نکلتے ہیں "نسطاس مستقیم" "حدیث الجنود" "نعام خصوصیہ" "نوامیس طبیعہ" "شئون داخلیہ" اور اسی طرح کی نہ جانے کتنی بھاری بھرکم ترکیبیں، اپنی ثقالت کے باوجود مولانا کے قلم سے نکل کر ان کے جملوں کے صوتی ترنم، اور غنائی آہنگ کی خالق بن جاتی ہیں، انھوں نے "طلسم سرائے ہستی" "شب دوشیں" "نشۂ نیم شبی" "صبح خمار" "شیوۂ طراز دوست" "لیلائے شب" "جلوۂ یوسفی" "نسیم پیراہن" "نظر نواز بزم و انجمن" "رمز فروشی" "حریف پرور ادائیں" وغیرہ جیسی حسین و دلکش ترکیبوں سے اردو زبان کے حسن و جمال کو بڑھایا ہے اور ان کو اس ترتیب و تنظیم کے ساتھ آراستہ کیا ہے

جو اعلیٰ درجہ کی عسکری صف آرائی میں ہوتی ہے، عبدالماجد دریا آبادی نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ :

"خدا جانے کتنے نئے اور بھاری بھرکم لغات اور نئی ترکیبیں اور نئی تشبیہیں، نئے استعارے اور نئے اسلوب بیان میں ہر ہر ہفتہ اس ادبی و علمی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر باہر نکلنے لگے اور جاذبیت کا یہ عالم تھا کہ نکلتے ہی سکۂ رائج الوقت بن گئے۔ حالیؔ و شبلیؔ کی سلاست و سادگی سر پیٹتی رہی اور اکبر الہ آبادی اور عبدالحق (موجودہ بابائے اردو) سب ہائیں ہائیں کرتے رہ گئے"[1]

مولانا کی یہ مرصع انشار پردازی جس میں مغلق اور ثقیل الفاظ حسن تناسب کے ساتھ استعمال کئے گئے، دقیق اور خشک مضامین میں بھی دلربایانہ شان اور فصاحت کی فضا پیدا کرتے ہیں، انھوں نے نہ صرف زندگی کے ہر شعبے میں تقلید اور روش عام سے پرہیز کیا بلکہ تحریر کے میدان میں بھی عام ڈگر سے الگ ہٹ کر اپنی ایک نئی راہ نکالی، یہ نئی راہ ایسی تھی کہ جس پر چلنے کی بہت سے لوگوں نے کوشش کی مگر وہ بھونڈی نقالی سے زیادہ آگے نہ بڑھ سکے، واقعہ یہ ہے کہ بقول قاضی عبدالغفار "ان کے آرٹ کا دیوتا بہت غیور اور مغرور ہے، اور اپنی انفرادیت میں شرک کو گوارا نہیں کرتا"[2] الہلال کے

---

[1] آثار ابوالکلام - آزاد کتاب گھر - دہلی - صفحہ ۱۴۳

مضامین لکھتے وقت انھوں نے ہمیشہ یہ نظریہ پیش نظر رکھا کہ " اجتماعی و فلسفی مباحث کے لئے ایک نئے طرزِ بیان و انشاء کا نمونہ پیش کیا جائے[1]" اس نئے طرزِ بیان میں ادب کو سرسید کی طرح اپنے نظریات کی تبلیغ کا حربہ تو بنایا گیا، مگر عبارت کی ناہمواری جو ان کے یہاں پائی جاتی ہے اس سے دامن بھی بچایا گیا، اور ان کے رفقاء کار خصوصاً حالی، نذیر احمد اور شبلی کے یہاں شوکت و حشمت اور عظمت و جلال کی جو کمی تھی اسے پورا کیا گیا اور سخت سے سخت اور ثقیل سے ثقیل الفاظ کو بھی مصنف نے اپنے نفسِ گرم اور خونِ جگر کی حدت سے پگھلا کر گداز عطا کر دیا، مولانا نے اس بات کا خاص اہتمام کیا، کہ عبارت روکھی اور بے مزہ نہ ہونے پائے، چنانچہ انھوں نے لکھا کہ:

"یہ قلمی پست ہمتی کم از کم ان لوگوں کے لئے تو جائز نہیں رکھی جاسکتی جنھیں خدائے تعالیٰ نے اپنے ہر طرح کے افکار کے ساتھ بیان کی قدرت نہ دی ہے۔ وَذَالِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ، اور ان پر بلاغت قرآنی کے درس و افادہ سے فیضانِ بیان کا ایسا دروازہ کھول دیا ہے کہ دقیق سے دقیق خشک مطالب کو وہ حسن و عشق کی دلچسپ داستان بنا سکتے ہیں"

آں نیست کہ صحرائے سخن جادہ ندارد
وانڈر روشِ کج نظری راچہ کند کس[2]

---

[1] الہلال، ۳۰ ستمبر ۱۹۱۲ء [2] الہلال، ۳۰ ستمبر ۱۹۱۲ء

اور یہ حقیقت ہے کہ حسب بالا جملوں کا اطلاق مولانا کی طرزِ تحریر پر جس طرح سے ہوتا ہے وہ دوسروں پر نہیں ہوتا، ان کے ہر ہر فقرے سے بقول صباح الدین عبدالرحمٰن[1] سامعہ و باصرہ دونوں لطف اندوز ہوتے ہیں جو ان کے قدرت بیان کی بہت بڑی دلیل ہے، ان کی تحریر میں یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ اس میں عقلی رنگ زیادہ ہے یا جذباتی، تحکمانہ انداز غالب ہے یا متکلمانہ استدلال، درحقیقت اس میں دونوں کا حسین امتزاج ہے جو ادب میں ان کے اجتہاد کا نتیجہ ہے اور جس میں وہ بالکل منفرد ہیں[2]۔"

مولانا ابوالکلام آزاد کے اس مخصوص اسلوب نے اردو نثر نگاری کو صدمہ پہونچایا یا اسے نئی توانائی عطا کی اس پر بعد میں بحث کی جائے گی لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اس دور میں جب مسیحی علماء نے اسلام پر طرح طرح کے حملے شروع کر دئے تھے مولانا آزاد نے اس انانیتی اسلوب بیان سے ان کی ذہنی پسپائی کو دور کیا اور اپنے زورِ قلم سے وہ وہ کام لیا جو محققین اپنی بلند پایہ تحقیقی تصنیفات سے لیا کرتے ہیں، ان کا قلم شمشیر بے نیام بن کر چمکا اور مدافعانہ پہلو اختیار کرنے کے بجائے اس نے بڑھ کر دوسری قوموں پر جارحانہ حملے شروع کر دئے۔ مصریوں کے بارے میں انھوں نے لکھا:

" ہم کو نہیں معلوم کہ عظیم الشان مصری دنیا میں کیوں آئے تھے لیکن ہم نے ہیروغلیفی نقوش کے اندر پڑھا ہے کہ انھوں نے

---

[1] صباح الدین عبدالرحمٰن، معارف جون ۱۹۵۸ء۔ صفحہ ۴۱۷ [2] ایضاً

بڑی بڑی قوموں کو غلام بنا کر ذلیل وخوار کیا' ان کو عجیب عجیب طرح کے آلہ ہائے تعذیب کے شکنجوں میں کسا جن کی تصویریں ممفس کے مندر میں دیکھ کر ہم اشک آلود ہیں[1]۔

روم کے ہولناک فاتحوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا:

"ہم نہیں جانتے کہ روم کے ہولناک فاتحوں کا جن کے سر پر تمدن تعلیم کا سب سے زیادہ درخشاں تاج نظر آتا ہے کیا مقصد تھا؟ مگر ہم نے شمالی افریقہ میں کئی میلوں تک پھیلا ہوا ایک تودہ دیکھا ہے جس کے اندر سے کارتھیج کی دیواروں کی ٹوٹی ہوئی اینٹیں نکلتی رہتی ہیں' اور ایران وشام کی خاک کے ذرّے کہتے ہیں کہ ہمیں سب سے زیادہ خون ان ہی رومی تلواروں کی لعنت سے نصیب ہوا ہے[2]۔"

اسی مضمون میں آگے چل کر انھوں نے قدیم ایران کی داستان بھی دُہرائی:

"تاریخ عہدِ قدیم کی تاریکی ہمیں کچھ نہیں بتلاتی کہ وہ عظیم الشان ایرانی جنھوں نے اصطخر کی عظیم الاثر محرابیں بنائیں اور اپنی روایتوں کے اندر دیووں سے لڑے اور تمام بحر و بر کو تختِ ایران کے آگے سربسجود دیکھا' دُنیا میں کیوں نمایاں ہوئے تھے اور دنیا نے ان سے کیا پایا۔ البتہ دریائے فرات کے کنارے کے وحشت ناک تودے اور کہیں کہیں سے اُبھر کر نظر آجانے والی شکستہ دیواریں اپنے اندر

---

[1] الہلال' ۱۶ ستمبر ۱۹۱۲ء

[2] الہلال' ۱۶ ستمبر ۱۹۱۲ء

ایک تاریخی عمل منور رکھتی ہیں اور ایران کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتلاتی ہیں کہ عہد قدیم کے عظیم الشان کشور متمدن یعنی بابل پر خونخوار درندوں کی طرح چڑھ آئے اور اس کی عجیب الصناعتہ دیواروں کے نیچے بربادی اور تباہی نے ان کے مقصد ظہور پر نوحہ پڑھا۔[1]

اور اس کے بعد انھوں نے پھر خود بابل کے متعلق لکھا:

"پھر وہ خود بابل (جو ایرانیوں کی خونخواری پر نوحہ خواں ہے) دنیا میں کس غرض سے آیا تھا اور کیا کر گیا، یہ سچ ہے کہ اس نے معلق باغ بنائے جو بڑے ہی عجیب تھے، اور آج بھی عجیب سمجھے جاتے ہیں لیکن اس کے تمدن و انسانیت کے ان باغوں کے ساتھ کیا گیا، جو گو عجیب نہ تھے لیکن باغبان دنیا کے ہزارہا برسوں کی محنت کی کمائی تھی، ہولناک بخت نصر کا تاراج کن سیلاب جب شام میں پھیلا ہے تو یروشلم (بیت المقدس) کی زمین کا چپّہ چپّہ شادابی و سرسبزی کی بہشت تھا، لیکن بابل کے متمدن فرزند وہاں اس لئے آئے تھے کہ زندگی کی شادابی کی جگہ آگ کے حرفوں کے نقشوں میں اپنے ظہور کا مقصد لکھ جائیں۔ فَجَاسُوا خِلٰلَ الدِّیَارِ وَکَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا۔"[2]

دنیا کی نگاہ میں متمدن قوموں کی تاریخ اور اکتسابات پر اس جارحانہ حملے کے

---

[1] الہلال - ۱۶ ستمبر ۱۹۱۲ء [2] الہلال - ۱۴ ستمبر ۱۹۱۲ء

بعد جس میں ان کی خوں ریزی اور خون آشامی کی داستان دہرائی گئی ہے انھوں نے تضاد اُجاگر کرتے ہوئے مسلمانوں کے بارے میں لکھا:

"لیکن دنیا کی ان تمام بڑی سے بڑی قوموں کے بعد ہمارے سامنے صرف ایک قوم ایسی آتی ہے جس نے اپنے ظہور کے پہلے ہی دن اپنا مقصد بتلا دیا تھا اور جو محض قوتوں کا ایک ہجوم اور طاقتوں کا ایک اجتماع اور قہر و استیلائے بہیمی کا ایک انقلابی سیلاب نہ تھا جو آیا اور خون بہا کر چلا گیا بلکہ طے شدہ کاموں کا ایک کھلا اور اعلان کردہ پروگرام تھا جسے اپنے ہاتھوں میں لے کر وہ دنیا کی اُجڑی ہوئی آبادیوں اور برباد شدہ علوم و تمدن کی یادگاروں کے سامنے نمودار ہوئی۔ الذین ان مکنّاھم فی الارض اقاموا الصّلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوعن المنکر وللہ عاقبۃ الامور"

اسلام کی تاریخ اور دوسری قوموں کی تاریخ میں اس تضاد کو اجاگر کرنے کے بعد ایک بر تر پندار کے ساتھ انھوں نے پھر لکھا:[1]

"کبھی کبھی وہی پانی جو طوفان بن کر موجیں مارتا ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ ابر کرم کا چھینٹا بن جاتا ہے، کبھی کبھی زمین کی وہی حرکت جو زلزلہ بن جاتی ہے، ایسا بھی انقلاب ہوتا ہے کہ سبزہ کی لہک

---

[1] الہلال - ۱۲ ستمبر ۱۹۱۲ء

اور بوئے گل کی موج بن جاتی ہے اور کبھی کبھی ہوا کا وہی تند جھونکا جو آندھی بن کے چلتا ہے ایسا بھی ہوا ہے کہ نسیم خوش گوار بن کے چلنے لگا ہے، یخرج الحیّ من المیّت و یخرج المیّت من الحیّ اسلام اسی ابرِ کرم کا چھینٹا، اسی بوئے گل کا قافلہ اسی نسیم سحر کی موجِ حیات تھا، بخت نصر نے بیت المقدس کو برباد کر دیا تھا، ایرانیوں کے حملے سے بابل کا تمدن منہدم ہو گیا تھا، ایران کے در و دیوار سکندر کے حملوں سے چور چور ہو گئے تھے لیکن فرزندانِ اسلام نے خدا کی راہ میں جان و مال کو برباد کیا تاکہ دنیا کو آباد کریں انھوں نے اپنے آپ کو مٹایا تاکہ دنیا کی مٹتی ہوئی یادگاریں پھر زندہ ہو جائیں، انھوں نے اپنے خون کو بہایا تاکہ دنیا کے چہرے کا وہ آب و رنگ پھر عود کر آئے، جس کو وحشیانہ حملوں کے سیلاب بہا لے گئے تھے۔[1]"

اور پھر انھوں نے یہ بتلایا کہ اسلام نے تلوار ضرور اٹھائی مگر قتل اور غارت گری کے لئے نہیں، وہ لکھتے ہیں :۔

" انھوں نے اس پاک مقصد کے لئے تلوار ہاتھ میں لی اور دنیا نے دیکھ لیا کہ جو چیز سر رشتۂ حیات کو پہلے کاٹ دیتی تھی وہ اب تمدن کے بکھرے ہوئے اجزا کو کیوں کر جوڑ رہی ہے دنیا نے دیکھ

---

[1] الہلال - ۱۶ ستمبر ۱۹۱۴ء

لیا کہ عرب کے جن میدانوں میں خاک اُڑ رہی تھی ان میں نسیم خوش گوار کے جھونکے چلنے لگے، ایران کے مٹے ہوئے نقش و نگار اُبھر آئے، یونان کی برہم شدہ مجلس علم پھر گرم ہو گئی، مصر و شام کا کاروان رفتہ پھر لوٹ آیا، بیت المقدس پھر تمدن کا قبلۂ مقصود بن گیا پہلوں نے جو کچھ بویا تھا انھوں نے زندگی بخشی، ٹیٹس رومی یروشلم آیا تھا کہ برباد کر دے لیکن اعراب حجاز یروشلم گئے تاکہ اس کے لٹے ہوئے باغوں کو سرسبز و شاداب کردیں، رومیوں کی فوجیں افریقہ اور ایران سے گذریں لیکن ان کی راہوں میں ہلاکت اور بدحالی تھی، ٹھیک ان ہی زمینوں پر سے مسلمان بھی گذرے مگر ان کے ساتھ تمدن و آزادی اور امن و اقبال کے فرشتے سایہ فگن تھے۔"

فانظر الیٰ اٰثار رحمۃ اللہ کیف	بس اللہ کی رحمت کی ان نشانیوں کو دیکھو کہ
یحی الارض بعد موتھا ان	اس نے کس طرح زمین کو از سر نو زندگی
ذالک لمحی الموتیٰ وھو علیٰ	بخشی جبکہ وہ مرچکی تھی بیشک وہ موت کو
کل شیئ قدیر۔	حیات سے بدلنے والا ہے اور سب کچھ کر سکتا ہے۔

اسلام کی مدافعت اور دوسری قوموں کے تمدن پر اس کے جارحانہ حملوں نے مسلمانوں کی ساری شکست خوردگی اور انفعالیت کو دور کر دیا، اور ان کے دلوں میں خودداری خود شناسی اور خود اعتمادی کے جوہر پیدا کر دیے۔

مولانا کی تحریریں مسلمانوں کے لئے جہاد زندگانی میں یقین محکم، عمل پیہم اور محبت فاتح عالم کی جیتی جاگتی تفسیر بن گئی، ان کا ہر ہر لفظ خلوص سے پُر

ہے، انھوں نے جو کچھ کہا ہے اسے خود پہلے اپنے دل میں محسوس کیا ہے اور الفاظ کے ذریعے اپنے جذبات وخیالات کے اُٹھتے ہوئے طوفان کو ایک زبردست طوفان بنا دیا ہے، ایسا طوفان جو اپنی فوق فطری طاقت سے ساری گندگیوں کو پاک صاف کر دیتا ہے۔ نعیم الدین نے ٹھیک ہی کہا ہے:

"ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں یہی فوق فطری زور ہے اور اس زور کی وجہ سے ان کی انشا محض انشائیہ لفظوں کا مجموعہ نہیں معلوم ہوتی، یہ ایک کھینچی ہوئی تلوار، ایک بڑھتا ہوا سیلاب، ایک اُٹھتا ہوا طوفان، اور ایک دنیا کو ہلا دینے والا بھونچال ہے، یہ ایسا عصائے موسوی ہے جو افعی بن کر ہر شے کو نگل جاتا ہے۔"[۱]

مولانا کے اس اسلوب میں بقول رشید احمد صدیقی "عجم کا حسنِ طبیعت اور عرب کے سوز و دروں کے ساتھ ساتھ شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، اور نطق اعرابی کی جھلک ملتی ہے"[۲] اور بقول صباح الدین عبدالرحمٰن اس انداز نے مسلمانوں میں خود دارانہ بلکہ مغرورانہ احساس پیدا کر کے ان کو بیسویں صدی میں حیاتِ نو بخشی، اور جب مسلمانوں کی گردن میں یورپ کی ناہمارانہ اور کورانہ تقلید و عبودیت فکر کی زنجیریں لپٹی ہوئی تھیں، اس کو مولانا نے اپنے زورِ قلم اور مؤثر انداز بیان سے یہ حقیقت ان کے ذہن نشین کرا دی کہ "اسلام ایک روحانی انقلاب تھا جو اس لئے ہوا کہ دنیا تغیر کے لئے بے قرار اور تبدیلی کے لئے تشنہ تھی اور جب

۱؎ سنبھالئے گفتنی۔ صفحہ ۲۳۷۔ فروغ اردو۔ لکھنؤ۔ اکتوبر ۱۹۵۵ء

۲؎ رشید احمد صدیقی، ماحول آزاد نمبر ۱۹۶۰ء

کوئی نہ تھا جو اس کی پیاس بجھا سکے، اور اس کے لئے مضطرب ہو، وہ سمندر کی طغیانی نہ تھا جو زمین کی پستیوں پر چڑھ آتی ہے بلکہ سرچشمۂ ہدایت و فیضانِ الٰہی کا ایک سرجوش آسمانی تھا جو برسات کے پانی کی طرح زمین پر برسا کہ اسے سیراب کر دے، وہ انسانوں کی درندگی نہ تھی جو اپنے ابنائے جنس کو سانپوں کی طرح ڈستی اور بھیڑیوں کی طرح چیرتی پھاڑتی ہے بلکہ خدا کی محبت اور فرشتوں کی برکت کا ایک ظہور الٰہی تھا جو نسلِ آدم کے بچھڑے ہوئے گھرانوں کو یکجا کرتا اور زمین کو اس کی چھینی ہوئی انسیت اور سعادت واپس دلاتا تھا۔[1]

۱۲

طنز و مزاح

الہلال کے مضامین میں کچھ ایسے بھی ہیں جس میں طنز کا لہو گردش کر رہا ہے، مزاح نگار اس فرد کے ساتھ جس کا وہ مضحکہ اڑاتا ہے، ایک ذہنی کھیل میں شریک ہو جاتا ہے اور اس سے محظوظ ہونے لگتا ہے، لیکن طنز نگار کا معاملہ اس سے کچھ جدا ہے، طنز کے پس پشت مرکزی خیال یہ ہوتا ہے کہ خود طنز نگار ان تمام حماقتوں سے محفوظ ہے جن کی وہ ہنسی اڑا رہا ہے اسے اپنے نشانۂ تمسخر سے کوئی ہمدردی نہیں پیدا ہوتی، وہ رونالڈ ناکس کے الفاظ میں مزاح نگار کی طرح ہرن کے ساتھ نہیں بھاگتا بلکہ کتوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہے[2]۔ مزاح نگار زندگی کی ناہمواریوں سے محظوظ ہوتا ہے، مگر طنز نگار

---

[1] الہلال - ۵ر اگست ۱۹۱۴ء

[2] RONAL KNOX — ESSYS ON SATIRE PAGE 31

ان ناہمواریوں سے نفرت کرتا ہے اور انھیں خندہ واستہزا میں اُڑا دینے کی طرف ہر دم مائل رہتا ہے، بہ بقول ڈاکٹر وزیر آغا " ایک باشعور، حساس اور درد مند انسان کے ذہنی ردِ عمل کا نتیجہ ہے جس کے ماحول کو ناہمواریوں اور بے اعتدالیوں نے تختۂ مشق بنا لیا ہو" [1]

اُردو ادب میں طنز کا عروج بھی بڑی حد تک اسی ردِ عمل کا رہین منت ہے جو ایک غیر ملکی تشدد، مسلسل سماجی اُلجھنوں اور فرد کی زندگی میں مسلسل ناکامیوں کے باعث پیدا ہوا، مولانا نے کہیں کہیں پر ان ناسوروں پہ تیز تیز نشتر چلائے ہیں جو اس دور کی سیاسی اور مذہبی بے اعتدالیوں کی پیداوار تھے اور جن کے باعث معاشرہ کے اندر اُلجھنیں پیدا ہو رہی تھیں مگر انھوں نے دوسروں کی پردہ دری اور عیب جوئی کرنے وقت لطیف اور فن کارانہ پیرایۂ اظہار اختیار کیا ہے اور کسی خاص فرد کے عیب کی پردہ دری کو زندگی اور سماج کی عالمگیر ناہمواریوں کی پردہ دری کا وسیلہ بنایا ہے۔ یہی نہیں بلکہ مزاحیہ موضوعات پر بحث کرتے وقت انھوں نے صنعت کارانہ سنجیدگی سے کام لیا ہے اور اسی بنا پر ان کی مزاحیہ اور طنزیہ تحریریں بھی سنجیدگی کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ اس طنز میں تیزی اور تلخی کے ساتھ ساتھ آفاقیت کے بھی جوہر پوشیدہ ہیں، خورشید الاسلام نے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ ان کی زبان عہد نامۂ عتیق کی زبان ہے، ان کا طنز بھی عہد نامۂ عتیق کا طنز ہے، جس میں ہیجان وخطابت اور ظاہری شان وشوکت بھی کچھ کم نہیں [2] مسلم یونیورسٹی

---

[1] اُردو ادب میں طنز و مزاح۔ [2] تنقیدیں۔ صفحہ ۶۸ طبع اول ۱۹۵۷ء۔

فاؤنڈیشن کمیٹی کے ایک جلسہ کے سلسلے میں انھوں نے مولانا محمد علی پر وار کئے، جن کا چھیڑنا آسان کام نہ تھا، اس لئے کہ وہ بقول ڈاکٹر عبدالحق ایک آتش فشاں پہاڑ یا گلیشر تھے، جس میں عظمت و شان کے ساتھ خطرہ بھی موجود تھا، حدیث الغاشیہ کے بعض ٹکڑے اردو طنزیہ نثر نگاری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہیں جس پر مولانا کی انفرادیت کی چھاپ پڑی ہوئی ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں :-

"غرضکہ آٹھ بجے سے جلسہ منعقد ہوا اور صاحبانِ حل و عقد کا منتظر تھا لیکن کسی بزرگ کا پتہ نہیں، اور اب پتہ لگے تو کیونکر جس جنگ کے لئے یہاں فوج جمع تھی، اس کی صلح رات کے دو بجے کی تاریکی ہی میں انجام پا چکی تھی، اب جلسہ میں شرکت کے لئے کیا ایسی جلدی آ پڑی تھی، جو جلدی کی جاتی؟ بہرحال ادھر رونمائی میں دیر، ادھر مشتاقانِ دید کی بے صبری عجیب کشمکش تھی ؎

ہوتا ہے اژدہامِ تمنا اسی قدر ہوتی ہے جتنی دیر کشودِ نقاب میں

خدا نواب اکبر کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب بطور مقدمۃ الجیش کے تشریف لائے، گو خود ان کا آنا جلوۂ یوسفی نہ تھا، لیکن اپنے ساتھ "نسیم پیرہن" کی بشارت ضرور رکھتا تھا، انھوں نے سب سے پہلے "صحبتِ نیم شبی" کا اعلان کیا اور "جنگل میں منادی کرنے والے یوحنا" کی طرح خبر دی کہ "راہ صاف کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت اب قریب ہے" یہاں تک کہ دس بجے صدہا نظر ہائے منتظرہ اور صدہا ہائے منتظر کی صفوں سے گذرتی ہوئی" ارباب حل و عقد" کی قطار جلوہ فروش ہوئی

اور "مجلۂ راز عش کے تمام عروسانِ شب زندہ دار" ایک ایک کرکے نظر نواز
بزم و انجمن ہوئے، چہروں نے پہلی ہی نظر میں ارباب نظر سے رمز فروشی
کی کہ رات بھر میں رنگ بدل چکے ہیں ؎

شب تو شراب خوردۂ با تو نشانہا ست

انھیں میں ہمارے شیوہ طراز دوست مسٹر محمد علی بھی تھے، صحبتِ نیم شبی کا خمار
آنکھوں میں اور شب بیداری کی افسردگی چہرے پر جی میں آیا کہ بڑھ
کے پوچھیں ؎

تو بہانہ می نمائی بہ بر کسے بودی امشب — کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

لیکن ہمارے دوست نے اپنی رات کی حریف پردازیوں سے نئے
دوستوں کا ایسا حصار و ہجوم پیدا کرلیا تھا کہ اب اس کا موقع ہی کب
باقی رہا تھا؟

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف — افسوس وہ دل ربا ادائیں[1]

رعنائی سے پُر اس رنگین عبارت میں یا پوری حدیث الغاشیہ کے اندر جگہ جگہ طنز
کے جو تیر و نشتر چھپے ہوئے ہیں، ان کی ادبیت تو خاصہ کی چیز ہے، لیکن یہ تیر و نشتر اس
مذہبی اور دینی مشن کی غمازی کرتے ہیں جن کے اندر دور تک ابوالکلام کے فکر و نظر کی
جڑیں بکھری ہوئی ہیں، رشید احمد صدیقی کا طنز پہلی نظر میں ظرافت، دوسری میں
بلاغت اور تیسری میں انفرادی اور اجتماعی شامت کا احساس دلاتا ہے، مگر ابوالکلام

---

[1] الہلال - ۵ / مارچ ۱۹۱۳ء

کے یہاں پہلی ہی نظر میں ظرافت، بلاغت اور انفرادی و اجتماعی شامت سبھی کا احساس بیک وقت ہو جاتا ہے، وہ مسکرا کر طنز کے نشتر حریف کو مارتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں "غالباً کچھ زیادہ تکلیف نہ ہوئی ہوگی، یہ انجکشن آپ کی بیماری کے لئے بہت ہی مفید ہے" وہ بقول پنڈت جواہر لال نہرو کبھی کبھی اپنے علم کے پہاڑوں کو نرم و نازک بنا کر بلند مگر ظریفانہ انداز میں طنز نگاری بھی کرتے تھے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۱۰ء کو مسلمان رہنماؤں کا جو وفد لارڈ ہارڈنگ سے ملا تھا، اس کی تفصیل لکھتے وقت بھی مولانا نے طنز کے تیروں کا استعمال کیا ہے۔

نازم فریب صلح کہ غالب ز کوئے دوست ناکام رفت و خاطر امیدوار برد

بالآخر وہ ڈیپوٹیشن ۲۵ مارچ کی سہ پہر کو ہز ایکسلنسی لارڈ ہارڈنگ کے سامنے پیش ہوا۔

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دَیر میں قائمؔ
مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

ایک مفصل ایڈریس کے ذریعہ مسلمانوں کی امن پسندی اور وفاداری کے میثاق قدیم کی زبان معرف اور سر اطاعت کے ساتھ تجدید کی گئی،

جز سجدہ متاعے دگر از کس نہ پذیرفت
خاکے ز نقش قدم او اثرے داشت

ایک واقعی بات کو دہرانے میں چنداں حرج نہیں اور ارباب محبت جانتے

لہ خواجہ حسن نظامی بحوالہ صبح امید۔ سنگم کتاب گھر دہلی۔ فروری ۱۹۵۹ء۔ صفحہ ۳۱

ہر گز کسی کے لب جاں بخش سے اگر ایک بار بھی جواب مہر ملنے کی اُمید ہو تو سودائیان
عشق کو ہزار مرتبہ پکارنے سے بھی انکار نہیں ہوتا'

گو وہ سُنتے نہیں پر ہم تو کسی حیلے سے　　ایک دو بات محبت کی سُنا آتے ہیں

سوال عجز کے جواب میں جتنی مرتبہ نگاہ مہر کا نظارہ حاصل ہو جائے
عشق کا اندوختہ اور اُمیدوں کا خزانہ ہے۔

یاں عجز بے ریا ہے نہ واں ناز دلفریب　　شکر بجا رہا ہے گلہ بے سبب تنگ

تاہم موقع پر کوئی دل پسند شعر یاد آجائے تو ضیافتِ ذوق سے باز نہیں
رہ سکتا مولانا فیض الحسن مرحوم عربی کے ادیب تھے اردو کے شاعر نہ تھے'
تاہم کبھی کبھی اچھے شعر کہہ جاتے تھے' ایک دن کا پُر معاملہ شعر [illegible] بھولتا۔

پہلے ہی اپنی کون سی تھی قدر و منزلت　　پر شب کی منتوں نے ڈبو دی رہی سہی

خاص امتیاز کی بات یہ ہے کہ اس عطر مجموعہ میں ہر طرح کی خوشبوئیں شامل
تھیں' پیرانِ کہن سال بھی تھے اور جوانانِ عہد بھی' خرقۂ زہد بھی تھا اور زنّارِ
رندی بھی' سرہائے سجدہ پیشہ بھی تھے اور نگہ ہائے عشوہ [illegible] از کتنی پہلے کے لئے
عذر کی ضرورت نہیں ...... دوسرے اگر سوال و جواب کی ضرورت ہو تو
مفتی آزردہ مرحوم کی زبانی جواب پہلے سے سُن لیجئے ؎

میاد ر بزم بادہ کشی لے گئیں مجھے　　یہ کم نگاہیاں تری بزم شراب میں

مذہبی تلمیحات' ادبی صنائع اور مناسب شعروں کے انتخاب سے مولانا اپنی
طنز نگاری میں جان ڈالتے ہیں' اس طرز تحریر میں نہ تو متانت متاثر ہوتی ہے

لہ الہلال' یکم اپریل ۱۹۱۴ء

نہ رنگینی رندانہ ہے، بلکہ بقول ڈاکٹر اعجاز حسین "ایک ادیب کی سنجیدگی اور فن کار کی شوخی ہے جو موقع و محل کا لحاظ کرتے ہوئے اعتدال کے ساتھ دل و دماغ کو متاثر اور روح کو بیدار کرتی ہوئی اپنی راہ چلی جاتی ہے[1]"۔ اور یہی متانت اور رنگینی کا امتزاج ہے جو عبادت کو حسن بیان اور خیال کو شگفتگی اور رعنائی عطا کرکے ابوالکلام کی تحریروں میں انفرادیت پیدا کرتا ہے، انھوں نے خود لکھا ہے "اپنے طرز بیان کا شاکی ہوں کہ اسرار و رموز کی باتیں کبھی حسن و عشق کی کہانی بن جاتی ہے[2]"۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے الہلال کے کالم "افکار و حوادث" کو اردو صحافت کے طنز و مزاح کے سلسلے میں بہت اہم قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "اس کے (افکار و حوادث) کے زیر عنوان مولانا ابوالکلام آزاد خود بھی مسائل حاضرہ پر بحث و تمحیص کرتے تھے .... اکثر و بیشتر بہت سے نازک سیاسی حالات پر اپنے مخصوص انداز سے طنز کرتے جاتے تھے[3]"۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی یہ بات مولانا کے سلسلے میں سرے سے غلط ہے، اس لئے کہ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہونچ گئی ہے کہ "افکار و حوادث" مولانا ابوالکلام کی تصنیف نہیں تھے بلکہ انھیں سید سلیمان ندوی نے لکھا تھا، اس لئے انھوں نے اس ضمن میں جو کچھ بھی لکھا ہے اس کا اطلاق مولانا کی طرز نگارش پر اگر ہوتا ہے تو محض ایک اتفاقی امر ہے۔

---

[1] ڈاکٹر اعجاز حسین۔ ماحول آزاد نمبر ستمبر ۱۹۶۰ء [2] الہلال۔ ۸ دسمبر ۱۹۱۲ء۔ صفحہ ۹
[3] اردو ادب میں طنز و مزاح۔ صفحہ ۲۴۴۔

(۱۲)

عام طور پر یہ رائے دی گئی ہے کہ اردو نثر کو مشکل اور ناقابلِ فہم بنانے میں الہلال کا بہت بڑا حصہ ہے۔ رام بابو سکسینہ نے لکھا ہے" اکثر لوگوں کا میلانِ طبع اس طرف ہے کہ عبارت میں مشکل اور غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ بالقصد استعمال کئے جائیں تاکہ عبارت شاندار اور رنگین معلوم ہو، ممکن ہے کہ اس طرز کی ابتدا اس طرح ہوئی ہو کہ سرسید اور ان کے رفقا اور ان کے مقلدین (ان کی تقلید میں نہایت سیدھی سادی) مگر زور دار عبارت لکھنے کے عادی ہو گئے تھے، بعد کو بعض جدت پسند طبایع کو جب وہ روکھی پھیکی بدمزہ معلوم ہونے لگی تو اس میں رنگینیت اور علمیت کی چاشنی پیدا کرنے کے لئے عربی فارسی الفاظ کا بکثرت استعمال کیا جانا ضروری سمجھا گیا، گو اس طرز کو سرسید مرحوم کے طرز کا ردِ عمل کہنا چاہئے۔ ہمارے اس خیال میں اس طرز کے مخترع مولانا ابوالکلام آزاد ہیں، جنھوں نے اپنے مشہور اخبار الہلال میں اس کو بہت برتا۔"[1]

اس اقتباس کی ابتدائی سطروں میں فارسی اور عربی کے الفاظ کا بالقصد استعمال کا ذکر کرتے ہوئے اس طرز کی اختراع کو مولانا ابوالکلام آزاد سے منسوب کیا گیا ہے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ یہ طرز خاص مولانا سے شروع ہوئی لیکن یہ بات کہ انھوں نے بالقصد مغلق الفاظ کا استعمال کیا غلط ہے آج ہمارے لئے

---

[1] تاریخ ادب اردو، رام کمار پریس ۱۹۵۲ء حصہ نثر۔ صفحہ ۹۳۔

ممکن ہے کہ عربی و فارسی تراکیب سے پُر یہ عبارت مولانا کی کسی شعوری جدوجہد کا پتہ دیتی ہو لیکن مولانا کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی تھی، اُس کا فطری انداز تحریر اگر کچھ ہو سکتا تھا تو یہی تھا۔ یہ الفاظ اپنی فطری روانی کے ساتھ مولانا کے قلم سے نکلے مولانا جس خفتہ قوم کو خواب غفلت سے جگانا چاہتے تھے اس کے لئے سبک الفاظ سے زیادہ بھاری بھرکم الفاظ کی ضرورت تھی جو مولانا کی تعلیم و تربیت اور خاندانی وراثت نے انھیں عطا کر دیا تھا اگر یہ انداز تحریر فطری نہ ہوتا تو مولانا کی نثر میں وہ آہنگ وہ روانی اور وہ تنا زیر و بم پیدا نہ ہوتا جو ایک ادب پارے میں ہونا چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ مولانا کی زبان الہلال کے مضامین میں مشکل تھی، اور مولانا کو خود اس بات کا احساس بھی تھا جب ۱۹۲۷ء میں الہلال پھر سے جاری ہوا تو انھوں نے "اعتذار" کے عنوان سے پہلے شمارے میں لکھا:[1]

"ایک اہم سوال آئندہ سے الہلال کے مضامین اور ان کے طرز بیان کا ہے، یہ ظاہر ہے کہ الہلال کے فوائد عام نہیں ہو سکتے جب تک کہ اس کا دائرہ بحث و نظر عام فہم نہ ہو اور عام فہم جب ہی ہو سکتا ہے جبکہ مطالب کے سہل ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب بیان اور زبان بھی سہل ہو لیکن مشکل یہ ہے کہ ہر طرح کے مطالب کا عام فہم طریقہ پر بیان کرنا آسان نہیں، بعض دقیق اور علمی مطالب ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں کتنا ہی گھلا کر بیان کیا جائے، ایک حد تک مشکل اور گراں ضرور رہیں گے اس مشکل کا ہم نے یہ حل

---

[1] الہلال، ۱۰ر جون ۱۹۲۷ء

سوچا ہے کہ آئندہ الہلال میں دونوں قسم کے مضامین درج کئے جائیں، بڑا حصہ تو سہل اور عام فہم ہو لیکن کچھ حصہ بلند اور خاص قسم کا بھی ہو اس طرح عوام اور خواص دونوں کو ذوق نظر کا سامان مہیا ہو جائے گا' باقی رہا زبان کا معاملہ تو وہ ہر حال میں حتی الوسع اسہل اور صاف اختیار کی جائے گی کسی درجہ کا موضوع ہو لیکن اسلوب بیان مشکل اور دیر فہم نہ ہو گا۔"

مالک رام نے ٹھیک لکھا ہے :۔

" ان کی مادری زبان عربی تھی' ان کی تعلیم تمام تر عربی اور فارسی کی رہی تھی' پھر چونکہ ان کے مخاطب اصل مسلمان تھے اور موضوع سخن بھی دینی تھا اس لئے انھوں نے وہ زبان استعمال کی جو اس موضوع کے لئے مناسب تھی اور جو ان کے مخاطب بھی آسانی سے سمجھ سکتے تھے[۱]۔"

مولانا کا یہ اسلوب اقتضائے زمانہ کے مطابق تھا' اور اپنی خوبی اور خوبصورتی کے باوجود زمانے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا' لیکن یہ اسی "بدعت" اور اسی اسلوب کا فیض تھا کہ الہلال اور البلاغ کے مضامین کو ادبی درجہ نصیب ہوا اور مولانا ہی صرف ایک ایسے اڈیٹر ہیں جن کو مدیر کی حیثیت سے ادب کی صف اول میں جگہ ملی۔ انھوں نے بقول رشید احمد صدیقی اردو صحافت کو کلاسک کا درجہ

---

[۱] مالک رام ۔ ماحول آزاد نمبر ۔ ستمبر ۱۹۵۸ء

عطا کیا، مولانا کی تحریر صحافتی نہیں، تصنیفی ہوتی تھی، نظر حکیمانہ، انداز خطیبانہ اور آہنگ ملہمانہ، ان کی تحریر دل، تقریر دل، نیز ان کے سراپا کا جب کبھی خیال آتا ہے تو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے ازمنہ قدیم میں یونان کے زندۂ جاوید رزمیہ نگار مصروف کار ہوں۔ اپنے زمانے اور اپنے دیار میں مولانا یونانی دیوتاؤں سے کم نہ تھے۔

یہی وہ طرزِ تحریر تھا، جس سے محمد علی نے لیڈری سیکھی تھی، اور جس پر حسرت موہانی کی شاعری نے رشک کیا تھا، اور سجاد انصاری نے لکھا تھا:۔

"میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا تو یا مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لئے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم......
میرے نزدیک اقبال اور مولانا ابوالکلام حقیقی معنوں میں فوق البشر ہیں۔[52]"

ان تمام محاسن کے ساتھ ساتھ الہلال میں کہیں کہیں پر تاریخی، علمی اور واقعاتی غلطیاں ہیں، مثال کے طور پر ۱۹۱۲ء کی پہلی جلد کے چوتھے شمارے میں مصر پر نپولین کے حملہ کی تاریخ ۱۸۰۰ء لکھی گئی ہے۔ حالانکہ یہ حملہ ۱۷۹۸ء میں ہوا تھا۔ اسی مضمون میں ابراہیم کو دوم خدیو مصر لکھا ہے حالانکہ یہ لقب استعمال کرنے کا مجاز اس کی موت کے بہت بعد اس کا بھتیجا اسمٰعیل ہوا ہے،

---

[51] رشید احمد صدیقی، ماحول آزاد نمبر، ستمبر ۱۹۵۸ء [52] محشر خیال۔

ن سے پہلے اس عہدہ کا وجود نہ تھا احمد اعرابی نے مصر کی آزادی کے لئے فوجی بغاوت
سن ۱۸۸۲ء میں کی تھی۔ مولانا نے یہ لکھا ہے کہ یہ واقعہ ۱۸۷۷ء میں پیش آیا، العروۃ الوثقیٰ
کے بارے میں مولانا نے لکھا ہے کہ اس کے اٹھارہ نمبر نکلے، حالانکہ اس کا آخری شمارہ اٹھارہواں
شمارہ تھا، اور ایک اور شمارہ میں مصر کے قومی شاعر ابراہیم کو شامی شاعر لکھا ہے اسی طرح کی
بہت سی چھوٹی موٹی تاریخی اور واقعاتی غلطیاں الہلال کے صفحات میں ادھر ادھر
بکھری پڑی ہیں مثلاً جب لیڈر دوئے معلیٰ بند ہوا تو مولانا نے ۱۹۱۳ء کی دو قسطوں میں بڑے
تند و تیز اداریئے لکھے لیکن ان میں یہ بات شروع ہی میں لکھ دی کہ سیاسی میدان میں اور حکومت کے
خلاف ایجی ٹیشن میں ایڈیٹر اردوئے معلیٰ عرصہ سے خاموش رہے ہیں حالانکہ یہ بات
واقعہ کے خلاف ہے، اسی طرح مسلم گزٹ کے سلسلے میں جو اداریہ لکھا، اس میں
بہت واضح طور پر بیان کی گئی کہ مسلم گزٹ کو عوامی اور قوم پرور رنگ دینے کا کریڈٹ
وحید الدین سلیم کو نہیں جاتا۔ گزٹ پہلے ہی سے اسی انداز پر چل رہا تھا، مگر ان استدلالی
غلطیوں اور تاریخی غلطیوں کے باوجود الہلال کے عوامی تاثر پر کوئی فرق نہیں پڑا البتہ
لوگ ایسے ضرور تھے جو اس دور میں مولانا کی غیر معمولی ذہانت اور علمیت کا بیت سے
واقف نہ تھے، حظ و کرب کی بحث کے سلسلے میں عبدالماجد دریابادی نے ان کو لکھا تھا۔

"ہاں یہ جرم مجھ سے بلاشبہ سرزد ہوا ہے...... کہ میں نے اس شخص سے
دست گیری کی التجا نہیں کی جس نے گو اپنی خطیبانہ سحر بیانیوں سے ایک
بڑی جماعت کو مرعوب و مسحور کر رکھا ہے مگر جس کے خالص کمالات
علمی کا ثبوت مجھے اب تک باوجود سعی و تلاش کے نہیں مل سکا ہے۔....

لیکن الہلال کو اپنے دعویٰ پر اصرار ہے اور چونکہ یہ دعویٰ الہلال نے کیا ہے اس لئے کسی دلیل کی بھی حاجت نہیں محض اس کا اعادہ اور تکرار کافی ہے لیکن یاد رکھیے کہ خطیبانہ حربے عوام فریب تقریروں اور تحریروں میں خواہ کتنے ہی کارگر ہوتے ہوں لیکن علمی مباحث میں ان کا استعمال قطعاً بے محل وغیر مؤثر ہونے کے ساتھ بے حد خطرناک ہے ریاست اور مذہب مدت سے آپ کی تیغ خطیبانہ کے زخم خوردہ ہو رہے ہیں"[1]

مگر وہی مولانا عبدالماجد جب ذہن وشعور کی پختگی پر پہونچے تو تقریباً نصف صدی کے بعد انھوں نے مولانا کی زندگی کے کارناموں کا جائزہ لیتے ہوئے ۱۲ر مارچ ۵۸ء کو اپنے اخبار صدق جدید میں لکھا :

"تاریخ اردو میں ان کے نام مستقل باب ہی نہیں بلکہ بحیثیت صاحب طرز انشا پرداز کے ان کے نام کا باب، باب عالی شان ہونا چاہئے" اردو کو انھوں نے ایک مستقل اور بالکل نیا اسلوب بیان عطا کیا ہے یہ بات اور ہے کہ کوئی اور اس اسلوب کا نباہنا اپنے بس میں نہ پائے"[2]

۱۔ الہلال ۲۳ر اکتوبر ۱۹۱۲ء

۲۔ صدق جدید لکھنؤ ۱۲ر مارچ ۵۸ء